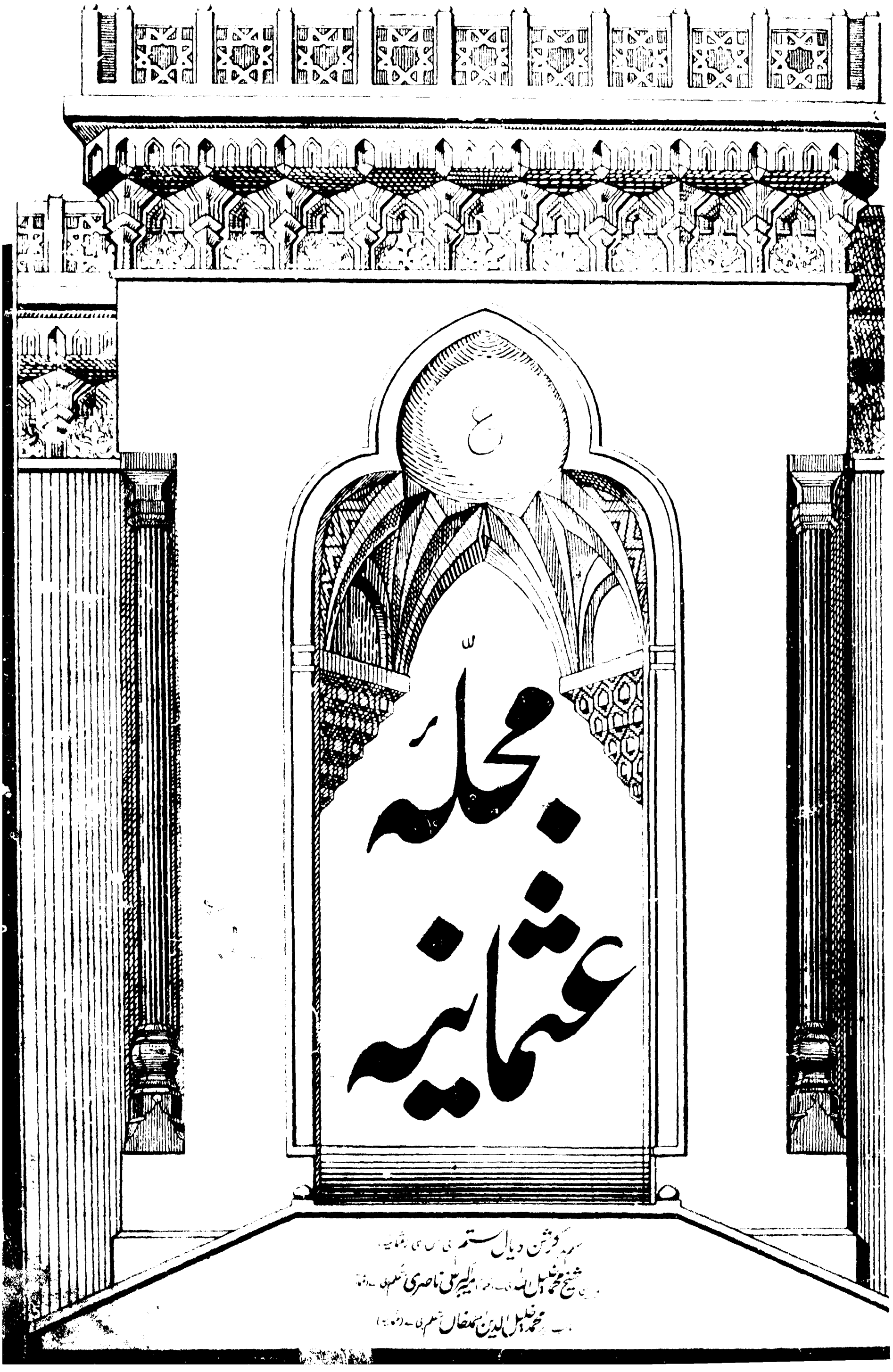

ع
مجلّہ عثمانیہ
کرشن دیال ستم
شیخ محمد جلیل اللہ
میر یعنی ناصری
محمد جلیل الدین احمد خان

مجلہ عثمانیہ

(جلد ۴ شمارہ ۳ ۰)

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

شیخ محمد خلیل اللہ
بی۔ اے۔ (عثمانیہ)

میر اکبر علی ناصری
متعلم بی۔ اے (آخری)

نائب مدیر

محمد خلیل الدین احمد خاں
متعلم بی۔ اے۔ (آخری)

مہتمم مدیر

کرشن دیال ستم
بی۔ یس سی (عثمانیہ)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

جلد (۱۴) شمارہ (۳)

مجلس انتظامی

۱۳۵۰ ف

(صدر)

مولوی قاضی محمد حسین صاحب

ام۔ اے۔ ال ال۔ بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام۔ اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ انگریزی

ڈی یس کرشنن صاحب ام۔ اے (آکسن) لیکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی یس سی پروفیسر طبعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

کرشن دیال صاحب متعلم بی یس سی (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصہ انگریزی

اراکین مجلس انتظامی

عبد الرزاق صاحب قادری جعفر نائب صدر انجمن اتحاد

میر اکبر علی ناصری صاحب مدیر حصہ اردو

شیخ محمد خلیل اللہ صاحب مدیر حصہ اردو

خلیل الدین احمد خاں صاحب نائب مدیر حصہ اردو

ملک الرحمن پٹیل صاحب نائب مدیر حصہ انگریزی

جلد (۱۴)

مجلس مشاورت

شمارہ (۳)

مولوی قاضی محمد حسین صاحب

ام اے ال ال۔ بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ اُردو)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ام اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(مشیر حصہ انگریزی)

وی یس۔ کرشن صاحب۔ ام۔ اے (آکسن) لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمٰن صاحب۔ بی یس سی۔ پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

آہ فانی

گزشتہ چند ماہ سے فانی مرض الموت میں مبتلا تھے خود انھیں بھی زندگی کی نبضیں ڈوبتی دکھائی دینے لگی تھیں سال رحلت نکل چکے تھے ان کی خواہش تھی کہ اپنے وطن میں دفن ہوں مگر یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ بالآخر اخبار میں یہ اطلاع چھپی کہ میر شوکت علی صاحب فانی سخت علیل ہیں احباب عیادت بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کی زندگی کا آفتاب ۲۔ مہر ۱۳۵۰ف کی شام کو غروب ہو گیا۔

کفن دفن تو کیا عود وگل کے لئے چند پیسے بھی فانی کے یہاں نہ تھے عجیب دردناک منظر تھا جبکہ شاعر کی میت اسکے مختصر سے کرایہ کے مکان سے نکل رہی تھی معلوم یہ ہو رہا تھا کہ کسی مفلس کا جنازہ ہے جس کی غریب الوطنی پر حسرتیں سر پیٹ رہی ہیں اور آرزوئیں ماتم کر رہی ہیں میت کو کاندھا دینے والوں میں چند شاعر اور چند مرحوم کے احباب واعزا تھے میت کیساتھ سادہ لوگ کلمہ کی بجائے بھرائی ہوئی آواز میں فانی کے درد بھرے اشعار پڑھ رہے تھے

اس عالم کس بپرسی میں شاعر کا جنازہ اس قبرستان میں پہنچا جہاں استاد داغ اور امیر مینائی آسودہ ہیں میت تربت میں اتاری گئی۔ آخری دیدار کے لئے کفن سرکا دیا گیا تو چشم عبرت نے دیکھا کہ شاعر کی آنکھیں نیم وا ہیں مگر چہرے پر سکون مرگ کی طمانیت چھائی ہوئی ہے۔ جتنے لوگ تھے سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے کسی کی زبان سے نکلا۔

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ		سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے

ایک نے کہا:۔ بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی		منہ پھیر لوں دنیا سے تو دنیا نہ رہے گی

غرض کہ اشعار کی گنگناہٹ میں اس غریب الوطن شاعر کی مٹی ٹھکانے لگی تو پھر کسی نے فانی کا یہ مصرعہ پڑھا۔		ثبت است سال رحلت فانی خدا نداشت

۱۳۶۰ھ

سخنے چند

ہر متمدن ملک کی جامعہ کا یہ ایک دستور رہے کہ وہ اپنے ملک کے قابل اور ممتاز افراد کی خدمات میں اعزازی طیلسان پیش کرکے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے بھی خانوادۂ آصفی کے ایک اور قابل فرد جنرل والا شان شہزادۂ معظم جاہ بہادر دام اقبالہٗ کی خدمت میں ال ڈی (ڈاکٹر اف لاز) کی اعزازی طیلسان پیش کرکے نہ صرف اپنے کو مفتخر کیا بلکہ فہرست طیلسانین کے وقار کو بڑھایا۔

حضرت والا شان کی شاعری تعمیراتی کارہائے نمایاں۔ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ میں فنون لطیفہ کا ذوق بدرجہ اتم موجود ہے ہم بکمال ادب شہزادۂ ممدوح کی خدمت میں انتہائی مسرت کے ساتھ ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ہم اپنی مادر جامعہ کو بھی مبارکباد دیتے ہوئے جملہ فیض یافتگان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ طیلسانی شہزادہ کی اس دعا کو

> "میری دعا ہے کہ علم کی ترویج میں ہم طیلسانیوں پر جو
> ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو محسوس کریں اور ہماری
> جامعہ قوم کی ذہنی اخلاقی تربیت کی ضامن ہو۔"

سنہری الفاظ میں لکھ لیں۔

اس مبارک ومسعود تقریب میں امیر جامعہ کی نشست پر رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی ایک نعم البدل شخصیت نظر آرہی تھی جو سراپا مشرقیت تھی یہ ہیں ہمارے نئے امیر جامعہ و نئے وزیر اعظم ہز ایکسلنسی نواب حافظ ڈاکٹر سر احمد سعید خاں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایل ایل ڈی۔

جب سے کہ نواب صاحب نے اپنے عہدہ کا جائزہ حاصل کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نباض نے بس نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ جہاں ریاست ابد مدت کے اندر مختلف تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے وہیں ہم طبیب حاذق سے ملتجی ہیں کہ ہماری مادر جامعہ کی نبض بھی دیکھ لیں۔

گزشتہ شمارہ چونکہ ڈبل شمارہ تھا اس لئے ہر قسم کے مضامین کو جگہ ملی تھی لیکن زیر نظر شمارے میں صرف چند ہی مضامین جگہ پا سکے۔

"اقبال اور مسئلہ جبر و قدر" کے عنوان سے داؤد خاں متعلم سال سوم نے ایک مضمون لکھا ہے جو معیاری اور تحقیقی ہے۔ اقبال کے اس مشکل نظریہ پر شائد بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ایک اور مضمون "صفر اور اس کی ایجاد" عظیم الدین متعلم سال چہارم کا لکھا ہوا ہے بالکل اچھی اور دلچسپ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے صفر پر کافی ریسرچ کیا ہے۔ دلائل اور براہین بہت معقول ہیں۔

سید محمود اکیلوی متعلم ایم اے شعبۂ دینیات کا ایک مضمون "عالم مثال" ہے جس میں عالم برزخ کی حالت کو عیاں کیا گیا ہے پہلی دفعہ اس قسم کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے ہم شعبۂ دینیات کے طالب علموں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین لکھ کر ہمارے مجلہ کے لئے بھجوائیں تاکہ ان کے معلومات سے دوسرے بھائی مستفید ہوں۔

جن مضمون نگار صاحبان کے مضامین شائع نہ ہو سکے ان سے معافی چاہی جاتی ہے کیونکہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے چند مضامین شائع نہ ہو سکے۔

سنا ہے کہ انجمن اتحاد نئے سال کے لئے نئی مجلس ادارت کا انتخاب کر چکی ہے۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ نئی مجلس ادارت کا استقبال کرتے ہیں اور "شکوہ" بہ جرس کے مضامین تیار ہیں لیکن موازنہ میں گنجائش نہ ہونے کی باعث طبع نہ کرا سکے ان کے حوالے کئے دیتے ہیں

"سپردم بتو مایۂ خویش را"

مجلہ کی ادارت سے رخصت ہوتے ہوئے ہم صدر صاحب مجلس انتظامی

مشیر صاحب ادبی مہتمم مدیر صاحب کے بدل شکور ہیں کہ ان حضرات نے مجلہ کی انتظامی مشکلات میں ہماری رہبری فرمائی۔

آخر میں برادران جامعہ سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے اپنی توجہ اور قلمی معاونت سے نہ صرف مجلہ کی پچھلی شکایات کو رفع کیا بلکہ بقول ڈاکٹر اقبال یہ ثابت کردکھایا کہ ؎

نہیں مایوس ہے اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

آئندہ بھی توقع ہے کہ عثمانیوں کے اس واحد ترجمان کا معیار گرنے نہ پائیگا۔ خدا حافظ

شیخ محمد خلیل اللہ
مدیر

علمیات

(۲)

تجربیت

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ، ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

تجربیت، جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے، وہ فلسفیانہ نظریہ ہے جس کی رو سے تمام علم کا مبداء و ماخذ تجربہ (حواس) قرار پاتا ہے۔ یونانی زبان میں علم کے لئے جو لفظ ہے اس کا مادہ (اد) "دیکھنے" کے معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا اہل یونان کے نزدیک علم کے متداولہ معنی "دیکھے ہوئے" کے تھے۔ اس کے ثبوت میں ہومر کی "الیاذہ" سے وہ عبارت پیش کی جا سکتی ہے جس میں شاعر "نبات الادب" (میوسس) کا ذکر کرتا ہے جو ہر چیز کو دیکھنے کے قابل ہیں، اس لئے تمام چیزوں کا علم رکھتی ہیں۔ یونان کے قدیم تر فلسفہ میں ادراک و تفکر کو ہم معنی سمجھا گیا ہے تفکر ادراک ہی کی ایک نوع قرار دی گئی ہے۔

لیکن صحیح فلسفیانہ معنی میں تجربیت کا بطور ایک نظریہ کے اس وقت آغاز ہوتا ہے جب حواس نہ کہ عقل علم کا واحد ماخذ و مبدء قرار پاتے ہیں۔ پروتاغورس (۴۸۰ تا ۴۱۱ ق م) جو فرقہ سوفسطائیہ کا سرخیل تھا، اس معنی میں تجربیت کا قائل تھا۔ ٹائمن نے اس کو "بنی نوع انسان کا خلاصہ" کہا ہے یہ جدلیات کا ایک زبردست ماہر تھا۔ الیاتیہ کے خلاف اس نے دعویٰ کیا کہ ادراک حواس ہی علم کا واحد مبدء ہے۔ عقل نام ہے ممتد مسلسل حواس کا۔ ہر شخص کو سوائے اپنے احساسات کے کسی شئی کا علم نہیں۔ جن اشیاء کا حواس کو علم نہیں ان کا وجود ہی نہیں جن اشیاء کا

ہمیں احساس ہوتا ہے، وہی ہمارے لئے وجود بھی رکھتی ہیں۔ چونکہ مختلف افراد کے احساس بھی مختلف ہوتے ہیں (جیسے ایک شئی جو مجھے سبز نظر آتی ہے تمھیں نیلگوں دکھائی دے سکتی ہے، مجھے بڑی اور تمھیں چھوٹی) اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جتنے افراد اتنی ہی صداقتیں؛ فرد ہی خطاء و صواب کا معیار رہے۔ پروتاغورس نے اس خیال کو ایک مخلد الذکر جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

"انسان تمام اشیاء کا معیار ہے" ہر شخص صداقت، نیکی و حسن کا خود معیار ہے۔ ایک شئی جو تمھیں فائدہ پہنچاتی ہے ممکن ہے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے، جو تمھارے لئے اچھی ہے ممکن ہے کہ دوسرے کے لئے بری ہو، جو تمھیں خوبصورت نظر آتی ہے ممکن ہے کہ دوسرے کی نظر میں کریہ ہو۔ جس چیز کو تم عملی صداقت کہتے ہو وہ بھی نظری صداقت کی طرح محض ایک اضافی شئی ہے، تعلیم و تربیت، مزاج و طبیعت کا معاملہ ہے!

فلسفۂ جدید میں جان لاک نے تجربیت کا احیاء کیا اور تجربہ کو علم کا ماخذ و مبدء قرار دیا۔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'فہم انسانی' کے پہلے حصہ میں حد سے زیادہ تنقید سے کام لے کر لاک یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان دنیا میں "وہبی تصورات" کا ذخیرہ لیکر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ڈیکارٹ کی وہبی تصورات والی تعلیم پر صریح حملہ ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ نہ تو نظری دائرہ میں اور نہ ہی عملی دائرہ میں کوئی ایسا تصور یا صداقت ملتی ہے جس کو ہم صحیح طور پر "وہبی" کہہ سکیں۔ مثال کے طور پر ان قضایا پر غور کرو جو نہایت بدیہی سمجھے جاتے ہیں مثلاً " ۱ ۱ ہے" "کسی شئی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وقت واحد میں وہ موجود بھی ہو اور نہ بھی ہو" "آنچہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند" خیال کیا جاتا ہے کہ ان کلیات کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے اور اس لئے یہ 'وہبی' 'حضوری' ہیں۔ لیکن لاک کہتا ہے کہ دیکھو، یہ وہبی کیسی ہو سکتی ہیں جب بچوں، وحشیوں اور مجنونوں کو ان کا مطلقاً علم نہیں۔ ان کو وہبی ماننے کی صورت میں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ذہن میں ایسے تصورات بھی موجود ہو سکتے ہیں جن کا ذہن کو کوئی شعور نہیں، اور یہ ایک تضاد لفظی ہے، یعنی ایک چیز ذہن میں ہے بھی اور نہیں بھی، اور یہ محال ہے۔ پھر اس امر پر غور کرو کہ قضایا اور صداقتیں وہبی کیسی ہو سکتی ہیں جب کہ وہ

تصورات جن کی ترکیب پر یہ مشتمل ہیں وہبی نہیں ؟ عینیت' اختلاف' امکان و عدم امکان کے تصورات نہایت تجریدی ہوتے ہیں جو مدتِ دراز کے تجربہ کے بعد حاصل ہوتے ہیں' پیدایش کے وقت ان کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ خدا تک کا تصور وہبی نہیں' کیونکہ بہت ساری قومیں ایسی موجود ہیں جنھیں خدا کے وجود کا گمان تک نہیں۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہر جگہ بنی نوع انسان کو خدا کا تصور حاصل ہے تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ خدا کا تصور وہبی ہے۔ آگ' آفتاب' حرارت کے تصورات کو محض اس وجہ سے وہبی نہیں ثابت کیا جاتا کہ نوع انسانی میں یہ ہر جگہ کلیتہً پائے جاتے ہیں۔ عقل رکھنے والی ہستی آفاق میں حکمت و قوت الٰہیہ کے آثار پر غور کر کے وجود باری کا انکار نہیں کر سکتی

لیکن تصورات وہبی کی تردید کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ہمارا سارا علم تجربہ سے ماخوذ و مستفاد ہے۔" ذہن ایک سفید کاغذ سے مشابہ ہے جو ہر قسم کے حروف سے معریٰ اور تمام تصورات سے خالی ہے۔ اب اس کا ساز و سامان کیسے مہیا ہوا ؟ وہ تمام ذخیرہ جس کو انسان کے بے پایاں تخیل نے ان بے انتہا تنوعات کے ساتھ فراہم کر رکھا ہے کیسے حاصل ہوا ؟ مختصر یہ کہ عقل و علم کا سارا مواد کیسے جمع کیا گیا ؟۔ اس کا جواب میں ایک لفظ میں یہ دیتا ہوں کہ تجربہ سے۔ ہمارے تمام علم کی بنیاد یہی تجربہ ہے' ہمارا سارا علم بالآخر تجربہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہی (خواہ اس کا استعمال محسوس اشیار خارجی کے لئے کیا جائے یا باطنی اعمال ذہنی کے لئے جن کا ہم ادراک کرتے ہیں اور جن پر ہم فکر کرتے ہیں) وہ چیز ہے جو ہماری فہم کے لئے موادِ فکر مہیا کرتا ہے۔ حس و تامل بس یہی وہ دو چشمے ہیں جہاں سے وہ تمام تصورات جو ہم میں موجود ہیں یا جو فطرۃً موجود ہو سکتے ہیں نمودار ہوتے ہیں . . . جہاں تک میں دریافت کر سکتا ہوں یہی وہ منافذ ہیں جن کے ذریعہ اس تاریک کمرہ میں روشنی جا سکتی ہے' کیونکہ میرے خیال میں فہم انسانی اس کمرہ سے کچھ زیادہ غیر مشابہ نہیں جس میں روشنی کا گزر نہیں اور جس میں چند ایسے روزن ہیں جو خارجی اشیار کے تصورات کو اندر داخل ہونے دیتے ہیں[۱]" ذہن کی رسائی کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع

---

[۱] فہم انسانی' کتاب دوم باب اول۔

کیوں نہ ہو اور افکار عالیہ کی وجہ سے وہ کتنا ہی رفیع و بلند کیوں نہ نظر آئے تاہم اس کی پرواز ان تصورات سے ایک ذرہ برابر آگے نہیں جو حس و تامل کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوتے ہیں"[1] اس طرح لاک تمام علم کا مبدا تجربہ کو قرار دیتا ہے اور تجربہ کا دو قسموں میں امتیاز کیا گیا ہے۔ حس[2] جس کے ذریعہ ذہن خارجی دنیا کا ادراک کرتا ہے، تامل[2] جس کے ذریعہ ذہن اپنے باطنی اعمال (جو حواس سے حاصل شدہ مواد کی ترتیب و تنظیم میں کام آتے ہیں) کا ادراک کرتا ہے۔ حس و تامل کے ذریعہ حاصل شدہ تصورات کو "تصورات بسیط"[2] کہا جاتا ہے۔ ذہن ان کے حصول میں بالکل منفعل ہوتا ہے۔ لیکن علاوہ ذہن کی اس انفعالی طور پر قبول کرنے کی صلاحیت کے وہ ان بسیط تصورات کو مختلف طریقوں سے ترکیب دینے کی بھی قوت رکھتا ہے۔ یہاں وہ منفعل نہیں فعال ہوتا ہے۔ ترکیب، تجرید، تقابل یہ وہ طریقے ہیں جن کی وجہ سے ذہن بسیط تصورات سے مرکب تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ لاک کے نزدیک عقل نام ہے ذہن کے ان ہی اعمال کا۔ اس کے نزدیک سارے علم کی توجیہ تجزیہ یعنی تحلیل و ترکیب سے کی جا سکتی ہے۔

ہیوم (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) نے لاک کے ان خیالات کی تکمیل کی ہے اور ان کو اپنے منطقی نتائج تک پہونچایا ہے۔ علاوہ ازیں ہیوم نے سوال کو کچھ ایسی شکل میں پیش کیا کہ اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی اور اس طرح فلسفیانہ فکر میں عظیم الشان ترقی ہوئی۔

لاک نے ذہن کو ایک حد تک فعال مانا تھا۔ بسیط تصورات کو ذہن ترکیب دیتا ہے ان کا آپس میں مقابلہ کرتا ہے، ان کی تجرید کرتا ہے اور اس طرح اضافات، جواہر اور شئون و احوال کے مرکب تصورات کو تشکل کرتا ہے۔ بسیط تصورات کے حصول کی حد تک ذہن بالکلیہ منفعل ہے، ان کے ذرائع حس و تامل کے سوا کچھ اور نہیں، لیکن مرکب تصورات کی حد تک وہ فعال ہے گو خلاق نہیں۔ مثلاً رنگ و شکل وغیرہ کے سادہ تصورات کو ترکیب دے کر وہ حسن کا مرکب تصور پیدا کرتا ہے۔

---

[1] فہم انسانی، کتاب دوم باب اول

[2] مثلاً رنگ، بو، امتداد، لذۃ، الم، وحدت وغیرہ۔ [3] حسن شئون و احوال کے مرکب تصورات میں داخل ہے

وہ مختلف صفات وکیفیات کو ایک "جوہر" کی طرف منسوب کر دیتا ہے جس میں ہو کر یہ پائے جاتے ہیں "جوہر وہ قائم بالذات شئی ہے جس کی ماہیئت کا ہمیں علم نہیں"۔ اسی طرح دریاز یا وہ چیزوں کو بازہ بازور کہہ کر اوران کا مقابلہ کر کے ذہن "اضافت" کے تصور تک جا پہنچتا ہے ۔

ہیوم ذہن کے فعّال ہونے کا منکر ہے۔ وہ ذہن کے علم یا نفسیات کو علوم فطریہ کے مشابہ بنانا چاہتا ہے اور اسی غایت کے تحت ان عام قوانین کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو قوانین فطریہ کے مماثل ہوں اور جن کے ذریعہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ مواد علم کی ترکیب ایک قسم کے ذہنی لزوم و وجوب کے ذریعہ عمل میں آتی ہے ۔

لاک کی طرح ہیوم کا بھی سوال یہی ہے کہ علم کا یہ سارا ذخیرہ کہاں سے فراہم کیا گیا؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ "ارتسامات" اور "تصورات" سے ۔ "ارتسام" کیا ہے ؟ اس کی دو قسمیں ہیں ۔ (۱) حسیات[1] یا خارجی ارتسامات، (۲) احساسات[2] یا جذبات یا باطنی ارتسامات۔ "تصور" کیا ہے؟ ارتسام کی نقل ہے ۔ ارتسامات و تصورات کے درمیان بیّن فرق یہ ہے کہ ارتسامات زیادہ اُجاگر، قوی، مبرہن اور صاف ہوتے ہیں بہ نسبت تصورات کے؛ وہ زماناً تصورات سے پہلے وقوع پذیر ہوتے ہیں لہٰذا وہ تصورات کے ضروری علل ہوتے ہیں، تصورات ان کے معلول اور نقل ہوتے ہیں ۔

اب اس نفسیاتی تعلیم کی فلسفیانہ و علمیاتی اہمیّت پر غور کرو۔ ہیوم کا اصرار ہے کہ ہمیں حقیقت خارجی کا علم ارتسامات یا تصورات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کما قلنا آلان ۔ تصورات مستلزم ہیں ارتسامات کو جوان سے متقدم ہیں، لہٰذا جاننے کے معنی ارتسامات حاصل کرنے کے ہیں ۔ لیکن ارتسامات ہیں کیا ؟ وہ یا تو حسیات ہیں یا احساسات ۔ لہٰذا ہمیں اسی چیز کا علم ہوتا ہے جس کا ہمیں حس ہوتا ہے یا احساس ہوتا ہے ۔

یہ ہے ہیوم کی "احساسیت" کی تعلیم (Sensationalism)۔ احساسیت کا اصول یہ ہے کہ کوئی سادہ تصور فکر میں جگہ نہیں لے سکتا جب تک کہ اس کی قیمت مرقومہ کوئی ابتدائی ارتسام نہ ہو، یعنی

[1] Sensations
[2] Feelings

جب تک کہ وہ کسی ارتسام کی نقل نہ ہو۔ یہ ہے ہیوم کی علمیات کا وہ واحد معیار جس پر ہر تصور کو صحیح اُترنا چاہیئے۔

اب وہ اُصول و قوانین کیا ہیں جن سے علم کے یہ پریشان عناصر (ارتسامات و تصورات) یکجا کئے جاتے ہیں؟ ہیوم کہتا ہے کہ ہمارے ذہن میں تصورات کی ترکیب بغیر ہمارے کسی قسم کے دخل و اختیار کے 'خالص میکانی طریقہ پر' چند مقررہ قوانین کے تحت ہوتی ہے۔ یہ قوانین ذہنی مظاہر کے لئے وہی مرتبہ رکھتے ہیں جو قانون تجاذب طبیعی مظاہر کے لئے۔ تصورات کے درمیان جو تعلقات و اضافات پیدا ہوتے ہیں ان کا دار و مدار تین "قوانین ائتلاف" پر ہے۔

۱۔ مماثلت۔

۲۔ مقارنت، مکان و زماں میں، اور،

۳۔ علیت۔

بالفاظ دیگر تصورات مماثل اشیاء کے تصورات کو، اور ان اشیاء کو جو زمان و مکان میں قریں ہوتے ہیں اور ان چیزوں کو جو علت و معلول کے رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں، باہم متوالف کرنیکا میلان رکھتے ہیں۔ ہیوم ان قوانین کی زیادہ تفصیل کے ساتھ توجیہ نہیں کرتا۔ ہیوم کے تعلیم کا یہ حصہ ائتلافیت کہلاتا ہے۔ بعد میں آنیوالوں نے اس کی تکمیل میں بڑی کوشش کی ہے۔

علوم فطریہ کا سارا دار و مدار قانون علیت پر ہوتا ہے۔ لہذا یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ ہمیں اس قانون کا علم کس طرح حاصل ہوتا ہے، اس کی اصل و ابتدا کیا ہے اور اس کی قدر و قیمت کیا؟ ارسطو کے زمانہ سے لے کر ہیوم کے زمانہ تک کسی فلسفی نے علیت کے تصور کی گہری تحلیل نہیں کی تھی۔ ڈیکارٹ اور لائبنیز نے بغیر کسی حجت کے چند علی اصول کے وجوب و لزوم کو تسلیم کرلیا تھا فلاسفہ جدید میں ہیوم ہی کے حصہ میں یہ شرف لکھا تھا کہ ربط علیت کا نہایت دقت نظری سے مطالعہ کرے۔ ہیوم کی یہ تعلیم اس کے فلسفہ کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ ہے۔

ہیوم کو 'ربط علیت' سے زیادہ دلچسپی اس لئے بھی ہے کہ اسی ربط کے ذریعہ ہم اپنے

حواس اور حافظہ کی شہادت سے آگے جا سکتے ہیں۔ اسی استدلال کی بنا پر کہ تصورات یا اشیاء یا واقعات کی ایک موزوں علت ہونی ضروری ہے' ہیوم کے تمام پیشرو فلسفیوں نے وجود باری کا استنباط کیا تھا اور سوائے لائبنز اور بار کلے کے تماموں نے مادّے کے وجود کا استخراج کیا تھا جو ذہن انسانی سے مستقل و غیر محتاج طور پر پایا جاتا ہے۔ اور اسی مفروضہ پر کہ واقعات کے معلولات و علل ہونے چاہئیں عوام الناس اور فلاسفہ ماضی و مستقبل کے حوادث کے متعلق نتائج اخذ کرتے ہیں۔

عام نقطۂ نظر سے ربط علیت کی دو اہم خصوصیات مانی گئی ہیں۔ عقلیہ نے بھی ان کو مانا ہے۔

(۱) علت و معلول میں ایک ضروری ربط پایا جاتا ہے۔

(۲) علت کو ایک قوت خیال کیا جاتا ہے مثلاً۔ بلیرڈ کی گیند میں ایک قوت پائی جاتی ہے جو ایک دوسری ساکن گیند کو ٹکر دیتی ہے۔ یہ قوت دوسری گیند کو حرکت میں لاتی ہے' دوسری گیند کی حرکت پہلی گیند کی حرکت کے بعد ضروری طور پر لازم آتی ہے۔

اس کے برخلاف ہیوم "علیت" کی تعریف یہ کرتا ہے کہ وہ (۱) واقعات کا ایک "رواجی ربط" ہے جو (۲) ذہن کے ایک تعین پر مشتمل ہے۔ اوّل الذکر تعلیم سے وہ اس امر کا انکار کرتا ہے کہ ربط علیت میں کسی قسم کا لزوم و وجوب پایا جاتا ہے' اور ثانی الذکر سے اس امر کا انکار کہ علت میں کسی قسم کی قوت' وہ قوت کو ایک ذہنی تعین قرار دیتا ہے ذیل میں اسکی نہایت مختصر تشریح پیش کی جاتی ہے۔

پہلا استدلال جس کی بنا پر ہیوم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ربط علیت ضروری و لزومی نہیں' جیسا کہ عقلیہ نے خیال کیا تھا' یہ ہے کہ جب ہم سے کسی علّی تسلسل کا ذکر کیا جاتا ہے تو ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ یہ مختلف ہو سکتا تھا' یعنی ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس علّت کا کوئی دوسرا معلول ہو سکتا تھا اور اس معلول کی کوئی دوسری علت۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ صرف مکرر تجربہ ہی کی بنا پر تو ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ حقیقی علل کیا ہیں اور حقیقی معلولات کیا ہیں۔ لیکن ہیوم کہتا ہے جس چیز کو ہم ربط ضروری یا ربطِ لزومی کہتے ہیں وہ ربط ہے جس کی نفی ناقابل تصور ہے اور جس کا علم ہمیں بغیر کسی تجربہ کی تکرار کے بدیہی طور پر ہو جاتا ہے مثلاً یہ ناقابل تصور ہے کہ ۳×۲ اور ۳ + ۳ میں جو اضافت ہے وہ سوائے مساوات کے کوئی اور ہو؛ جوں ہی مجھے الفاظ کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں

میں بغیر تجربہ کی تکرار کے اس مساوات کو جان لیتا ہوں۔ اس کے برخلاف مجھے یہ بات بغیر آزمائش اور تجربہ کے معلوم نہیں ہوسکتی کہ ترشہ کا ایک قطرہ نیلگوں کپڑے کو سرخ کردے گا۔ یہ قابل تصور ہے کہ ترشہ کپڑے کو سیاہ کردے۔ بالفاظ دیگر یہ ربط علّی لزومی وضروری نہیں، اس کے برخلاف ریاضیاتی ربط ضروری ولزومی ہوتا ہے۔ ربط علّی کا علم حضوری وذہنی طور پر نہیں ہوتا، صرف تجربہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ محض عقلی عمل سے بغیر کسی تجربہ کے ہم مشہور معلولات کے مانوس علل دریافت کرسکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جب حضرت آدمؑ کا آسمان سے زمین پر سقوط ہوا تو وہ بغیر کسی تجربہ کے یہ جاننے کی قابلیت رکھتے تھے کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ڈوباتا ہے۔ لیکن یہ خیال محض ایک التباس ہے۔ حضوری واد لی طور پر ہم علت ومعلول کے باہمی ربط کا علم نہیں حاصل کرسکتے، یہ صرف تجربہ کی تکرار پر مبنی ہے۔

بات یہ ہے (اور یہ ہیوم کا دوسرا استدلال ہے) کہ ہر واقعہ دوسرے واقعہ سے بالکل جدا چیز ہوتا ہے لہٰذا وہ اس سے قابل انفکاک ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو واقعات اس طرح باطنی طور پر قابل انفکاک ہوں ان میں کوئی ضروری اور لزومی ربط نہیں پایا جاسکتا۔ چونکہ ہر معلول بحیثیت ایک واقعہ کے اپنی علّت سے جدا واقعہ ہے لہٰذا اس کی تلاش ہم علت میں نہیں کرسکتے۔ بلیرڈ کے دوسرے گولے کی حرکت پہلے گولے کی حرکت سے ایک بالکل جدا چیز ہے اور نہ ہی ایک میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے جو دوسری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرے۔ ان ہی دلائل کی بنا پر ہیوم علیّت کے ربط لزومی کا انکار کرتا ہے، اس کے ذہنی یا حضوری ہونے کا انکار کرتا!

علیّت کے متعلق ایک دوسری غلطی جو ہیوم دور کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ اوپر بتلایا گیا ہے، وہ عام خیال ہے کہ خارجی علت میں ایک قوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ معلول کو پیدا کرتی ہے۔ ہیوم اس قوت کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اس کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

ہیوم کہتا ہے کہ اگر ہمیں اس قوت کا شعور ہوتا جس کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک شئے دوسری شئے پر استعمال کرتی ہے تو ہمیں اس قوت کا ارتسام بھی ہونا چاہئے تھا کیونکہ، جیسا کہ اوپر

سمجھا یا گیا ہے، ہیوم کی نفسیات کی رو سے ہمارے سارے تصورات ہمارے اپنے ارتسامات کے نقول ہوتے ہیں، ہمارے لئے کسی ہی چیز کے متعلق فکر کرنا ناممکن ہے جب تک کہ ہم نے اس کا خارجی یا باطنی حس سے ادراک نہ کیا ہو۔ لیکن جب ہم خارجی اشیاء کیطرف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کسی ایک مثال میں بھی قوت کا اکتشاف نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شئی دوسری شئی کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مثلاً بلیرڈ کی ایک گیند کی حرکت دوسری گیند کی حرکت کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی قوت کا ادراک نہیں ہوتا جو ایک گیند سے نکل کر دوسری میں نفوذ کر رہی ہو۔ جب قوت کا کوئی ارتسام حاصل نہیں ہوتا تو پھر ہم اس کا تصور کس طرح کر سکتے ہیں؟

اگر معترض یہ امکان پیش کرتا ہے کہ گو ہمیں قوت کا بدیہی ادراک نہیں ہوتا تاہم کیا اس کے وجود کا استنباط بھی نہیں کیا جا سکتا؛ علیت کا تصور ہمارے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم واقعات کے مسلسل و مکرر تواتر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تکرار سے اس تصور کو بطور استنباط حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن ہیوم اس کے جواب میں بجا طور پر کہتا ہے کہ "گزشتہ ارتسام کی محض تکرار سے گو یہ لامتناہی دفعہ کیوں نہ ہو، کوئی نیا تصور (مثلاً ربط لزومی) نہیں پیدا ہو سکتا؛ اس معاملہ میں ارتسامات کی کثرت تعداد اتنا ہی اثر رکھتی ہے جتنی کہ ایک مثال" ہیوم کا مطلب یہ ہے کہ علت محض ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تکرار ہوئی ہے؛ جب ایک واقعہ پہلی دفعہ وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ کوئی قوت نہیں رکھتا کیونکہ یہ بتلایا جا چکا ہے کہ کسی قوت کا براہ راست مشاہدہ نہیں ہوتا؛ اور کسی واقعہ کی محض تکرار سے اس کی صفات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ کوئی خارجی شئی ہمیں قوت کا تصور نہیں بخش سکتی تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا یہ ہمیں باطنی ذہنی اعمال پر غور و فکر کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ ہر لحظہ ہمیں باطنی قوت کا شعور ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ "محض ارادے کے حکم سے ہم اپنے جسم کے اعضاء کو حرکت دے سکتے ہیں یا ذہن کے ملکات کی ہدایت و رہبری کر سکتے ہیں"۔ لیکن ہیوم کہتا ہے کہ ارادہ کا جسم پر اثر ایک ایسا واقعہ ہے جو دوسرے فطری واقعات کی طرح محض تجربہ ہی سے

معلوم ہوسکتا ہے۔" ہر لحظہ ہمیں اس امر کا شعور ہوتا ہے کہ جسم کی حرکت ارادے کے حکم کی تابع ہے"، لیکن ارادے کی کسی قوت یا انرجی کا ہمیں کوئی بدیہی شعور نہیں ہوتا' یعنی ارادے کے شعور کے وقت مجھے کوئی بدیہی علم اس امر کا نہیں ہوتا کہ ذہن جسم پر کسی قوت کا استعمال کر رہا ہے۔

غرض ہیوم نے اپنی علیات کا یہ اصول قرار دے رکھا تھا کہ جب تک تصور ارتسام کی نقل نہ ہو۔ کوئی قیمت نہیں رکھتا' اس کا مرتبہ وہی ہوگا جو اضغاث احلام کا' اب قوت کا ارتسام نہ خارجی ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے نہ باطنی ذریعہ سے' یہ نہ حس ہے نہ احساس' لہٰذا اس کا کوئی وجود نہیں۔ علیت کا تصور ہمیں نہ شعور باطنی سے حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی حواس خارجی سے' یعنی علیت نہ کوئی لزومی و ضروری ربط ہے اور نہ ہی وہ کوئی قوت رکھتی ہے

لیکن اب بھی سوال باقی ہے کہ پھر علیت کا یہ تصور پیدا کیسے ہوا؟ ہیوم کہتا ہے کہ یہ کوئی ایسا تصور نہیں جس کی بنیاد منطقی ہو۔ اس کی اساس محض نفسیاتی ہے۔ ہم روزمرہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اشیاء متوالیاً یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں' مماثل اشیاء دائماً ساتھ ہوتے ہیں' شعلہ کے بعد حرارت' برف کے ساتھ سردی' بلیرڈ کی ایک گیند کی حرکت کے بعد دوسری گیند میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ بہت ساری مثالوں میں جب ہم دو قسم کی چیزوں کو ہمیشہ ایک ساتھ ملا ہوا پاتے ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ علّی طور پر مربوط ہیں' یعنی ایک دوسرے کی علت ہے۔ ایک کو وقوع پذیر ہوتا دیکھ کر ہم دوسرے کی توقع کرنے لگتے ہیں۔ ذہن عادت یا رواج کی وجہ سے اس امر کا یقین کرنے لگتا ہے کہ ان دو اشیاء میں ایک ربط ہے اور یہ دو ہمیشہ ایک ساتھ ہونگیں۔ دو چیزوں کو ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھ کر ۔۔۔ حرارت اور شعلہ کو' وزن و صلابت کو' ۔۔۔ ہم عادۃً ایک کے ظہور کے بعد دوسرے کے ظہور کی توقع کرنے لگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اشیاء کے دائمی ربط کا تجربہ ہم میں ان کے باہمی تعلق کا یقین پیدا کر دیتا ہے۔ یہ یقین روح انسانی کا ایک عمل ہے جبلت فطری کی ایک نوع ہے اور اتنی ہی نامدفوع اور لابدی ہے جتنی کہ وہ محبت جو فائدہ پہنچنے پر پیدا ہوتی ہے۔ اس یقین کی تعریف سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی کہ یہ وہ احساس ہے جس کے

معنی ہر شخص جانتا ہے، کیونکہ ہر شخص کو اس کا شعور ہوتا ہے۔ فطرت نے ذہن انسانی کے اس عمل کو جس کے ذریعہ علت سے معلول اور معلول سے علت کا استنباط کیا جاتا ہے عقل کے مغالطہ آمیز استدلال پر نہیں چھوڑا بلکہ جبلت یا میکانکی میلان کے ذریعہ اس کو مستحکم کر دیا۔

یہ ہے ایک مختصر اور سادہ بیان اس مشہور و معروف استدلال کا جو ہیوم اپنی شہرۂ آفاق کتاب Inquiry Concerning Human Understanding "فہم انسانی" میں پیش کرتا ہے۔ لاک نے اشیاء کو قوتوں سے متصف کیا تھا۔ ہیوم اس کا صریحی انکار کرتا ہے جیسا کہ بارکلے نے کیا تھا۔ لیکن بارکلے روحانی فعلیت کا قائل تھا، ہیوم اس کو بھی ایک التباس قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اگر ہم حضوری طور پر استدلال کریں تو ہر شئی ہر شئی کے پیدا کرنے کے قابل سمجھی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک کنکر کے گرنے سے چراغ آفتاب گل ہو جائے، یا ایک انسان کا ارادہ سیارات کی گردش کو روک دے"۔ ہیوم نے علیت کا جو تعمیری نظریہ پیش کیا ہے وہ اس امر کی توجیہ ہے کہ ہم دنیا میں ربط علیت کے وجود کے کس طرح قائل ہو گئے حالانکہ ہمارے ذہنوں میں سوائے ایک رواجی ابتلاف کے کوئی اور شئی حقیقت میں پائی نہیں جاتی۔

ھیوم نہ صرف قانون علیت کی تصورات کے ابتلاف کے ذریعہ توجیہ کر دیتا ہے، بلکہ اسی طریقہ سے ہماری ساری ذہنی زندگی کی توجیہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ مادہ اور ذہن کو بھی انہی اصول کی بنا پر سمجھا یا گیا ہے۔

ہمیں جوہر کا کوئی تصور حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا کوئی ارتسام نہیں: "میں ذرا فلسفیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کو جوہر کا تصور حس کے ارتسامات سے حاصل ہوا ہے یا فکر کے؟ اگر وہ حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو پھر میں دریافت کروں گا کس حاسہ سے اور کس طرح؟ اگر اس کا ادراک آنکھ سے ہوا ہے تو اس کو رنگ ہونا چاہیے، اگر کانوں سے ہوتا ہے تو اس کو آواز ہونی چاہیے اور ذائقہ کے ذریعہ تو مزہ ہونا چاہیے اور اسی طرح دوسرے حواس کا حال ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان میں کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ جوہر رنگ ہے یا آواز ہے یا ذائقہ۔ لہذا اگر تصور جوہر کا

وجود ہے تو پھر یہ ارتسامِ فکر سے ماخوذ ہوگا۔ لیکن ارتسامات فکر کی تحویل ہمارے جذبات و اشتہاآت میں ہو جاتی ہے جن میں سے کوئی بھی جوہر کا تصور عطا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا سوائے جزئی صفات کے ایک مجموعہ کے ہمیں جوہر کا کوئی علٰحدہ تصور حاصل نہیں ہو سکتا"

ہیوم کا یہ استدلال مادی جوہر اور روحانی جوہر دونوں کے خلاف موثر ہے، نہ مادے ہی کا وجود ہو سکتا اور نہ روح کا، نفس یا جوہر روح کے خلاف ہیوم اور دلائل بھی پیش کرتا ہے جن کا خلاصہ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔

ہیوم کا دعویٰ ہے کہ ذات یا نفس کا وجود نہیں؛ اس لئے کہ ہمیں ذات یا نفس کا کوئی ارتسام حاصل نہیں، تمام ارتسامات گریز پا اور سریع الزوال ہوتے ہیں اور اسی لحظہ فنا ہو جاتے ہیں جس لحظہ وہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور نفس کے متعلق تو یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ متوالی لحظوں میں اپنی عینیت قائم رکھتا ہے۔ یا اس دلیل کو اس طرح سمجھو کہ ہیوم کے اصول کی رو سے "ہر حقیقی تصور کے پیدا ہونے کے لئے ایک ارتسام کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن نفس یا ذات سے مراد کوئی ایک ارتسام تو نہیں بلکہ وہ شئی ہوتی ہے جس کی طرف ہمارے متعدد تصورات و ارتسامات منسوب کئے جاتے ہیں۔ اب اگر نفس کا تصور کسی ایک ارتسام سے پیدا ہوتا ہے تو پھر اس ارتسام کو ہماری ساری زندگی بغیر کسی تغیر کے جاری رہنا چاہئے۔ کیونکہ نفس اسی طرح موجود سمجھا جاتا ہے لیکن کوئی ارتسام ایسا نہیں جو مستقل و غیر متغیر ہو۔ لذت و غم، خوشی و الم، جذبات و حسیات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سب کے سب ایک ساتھ موجود نہیں ہوتے۔ لہٰذا نفس کا تصور ان ارتسامات میں سے کسی ارتسام سے حاصل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس تصور کا کوئی وجود نہیں" (ہیوم)

مندرجہ بالا استدلال ان ہی لوگوں کے لئے قابل تسلیم ہے جو ہیوم کے ارتسام والے نظریہ کے قائل ہیں۔ ان لوگوں کی تشفی کے لئے جو اس کے قائل نہیں ہیوم تامل ذہنی کی طرف براہ راست اپیل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مطالعہ باطن یا تامل سے ہمیں سوائے ارتسامات اور تصورات کے ایک خاص مجموعہ کے کسی اور شئی کا ادراک نہیں ہوتا۔

"جس کو میں اپنا نفس یا ذات کہتا ہوں جب اس کے اندر داخل ہو کر دیکھتا ہوں تو ہمیشہ سردی گرمی، روشنی تاریکی، محبت نفرت، لذت و الم، کسی نہ کسی خاص ادراک ہی کا پتہ چلتا ہے۔ بغیر کسی خاص ادراک کے اپنی ذات کو کبھی نہیں پکڑ سکتا نہ اس ادراک کے سوا کسی اور شئی کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ جس وقت میرے یہ ادراکات غائب ہو جاتے ہیں اسی وقت اپنی ذات یا نفس کا بھی ادراک نہیں رہتا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ موجود نہیں۔ اور اگر موت سے میرے ادراکات اسی طرح غائب ہو جاتے ہوں کہ جسم کے فنا ہو جانے کے بعد نہ میں خیال کر سکتا ہوں نہ احساس، نہ دیکھ سکتا ہوں اور نہ محبت کر سکتا ہوں نہ نفرت تو پھر میں قطعاً نیست ہو جاتا ہوں . . . . ."

لہٰذا ہیوم اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ" نفس مختلف ادراکات کی ایک ڈھیر یا مجموعہ کے سوا کچھ نہیں جن کو خاص خاص علائق متحد کر دیتے ہیں اور غلطی سے ان کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ کامل بساطت یا وحدت رکھتے ہیں"۔ جس موثر طریقہ سے برکلے نے مادّے کے وجود کی تردید کی تھی ہیوم نے اسی طرح ذہن کی تردید کر دی!

اس طرح ہیوم نے تجربیت کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہونچا دیا، وہ نتیجہ یہ ہے۔ نہ علیت ہی کا وجود ہے، نہ جوہر کا، نہ نفس یا ذات کا؛ ہماری علم کی دنیا دنیا ہی نہیں! صرف مختلف وجداگانہ مظاہر کا ایک مجموعہ ہے نہ کہ ربط باہمی رکھنے والے حصص کا ایک کل یا عناصر کی کثرت، کلیت نہیں! صرف ایک مجموعہ، نظام نہیں، یہاں جو کچھ بھی ربط و ترتیب دکھائی دیتی ہے وہ تخئیل کی پیدا کردہ ہے عقل کی نہیں۔ روح کے ابطال سے مذہب، قانون علیت کی تردید سے سائنس دونوں ہیوم کی ارتیابیت سے شکست کھاتے ہیں!

یہ ہے خلاصہ تجربیت کی علمیات کا۔ ہم نے دیکھا کس طرح تجربیت ارتیابیت کی طرف لیجاتی ہے۔ اب کانٹ ان نتائج پر غور کر کے اپنے خواب ادعائی سے جاگ اٹھتا ہے!

زندگی اور مرگ

اے جانِ جہاں اے روحِ رواں　　تو مرنے سے کیوں ڈرتا ہے

زندہ تو مر سکتا ہی نہیں　　جو مُردہ ہے وہ مرتا ہے

دانے میں جوشِ نمو ہے اگر　　وہ بن کر پیڑ اُبھرتا ہے

ہر سال عروسی ہے اس کی　　جب آئے بہار سنورتا ہے

پیراہنِ جاں ہے تیرا بدن　　جب کہنہ ہو تو اُترتا ہے

اس دل پہ فنا کا کیا ہے عمل　　جو کام بقا کے کرتا ہے

ہم ساقیٔ دہر کے ساغر ہیں

خالی کرتا ہے اور بھرتا ہے

عبدالحکیم

اصغر گونڈوی اور غزل گوئی

غزل گوئی کی مخالفت گذشتہ چند سالوں سے اس شد و مد کے ساتھ کی جارہی ہے کہ ملک میں دو مستحکم محاذ قایم ہو گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں جماعتوں کے لئے کوئی نقطۂ اشتراک پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔

یوں تو غزل گوئی کی تنگ دامانی کا حالی کے بعد ہی سے احساس پیدا ہو چلا ہے اور ہر ترقی پسند ادیب نے اِس تنگ و تاریک کوچے سے اُردو شاعری کو نکال لانے کی کوشش کی ہے لیکن عہدِ حاضر کے ترقی پسندوں نے اُن اعتدال کی حدوں کو بالکل توڑ دیا ہے حتیٰ کہ بعض بلند مرتبہ اور سنجیدہ فکر شاعروں کو بھی اُسی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیا ہے جو عام سطح پسندوں کے لئے مخصوص تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعری کی نشو و نما ابتدا ہی سے غیر ملکی اور ناسازگار ماحول میں ہوئی ہے اس لئے وہ ہماری زندگی کے اصلی پہلوؤں کو نمایاں کرنے سے قاصر ہے اور اسی احساس نے نوجوانوں کے غور و فکر کی قوتوں اور قلم و زبان کی توانائیوں کو اپنے ماحول کی ترجمانی کی طرف متوجہ کیا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اِن کی یہ کوششیں جو دراصل وقت کی ضرورت اور ماحول کا اقتضاء ہیں ہر طرح استحسان کی مستحق ہیں۔ لیکن اِس مکتبِ خیال کی ایک بڑی تعداد اس شدت سے انقلابی خیالات کی حامل ہے کہ وہ یکسر شاعری کے پرانے ایوان کو ڈھا دینا چاہتی ہے۔ حالانکہ اِن ایوانوں کی حفاظت جن کے نقش و نگار اور گل کاری کے اعلیٰ نمونے شاعری کے ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں اور جو موجودہ نسل کا ایک گراں ترین سرمایہ ہیں ضروری ہے! اگر ان ایوانوں کی گل کاریاں وقت کے مزاج سے ہم آہنگ

نہیں ہوسکتیں تو اس میں تبدیلی کرنے کا تو انہیں حق حاصل ہے لیکن اس کے لئے جوش سے زیادہ اعتدال مناسب ہے ۔ ان انتہا پسندوں میں سے بعض جوشیلے نوجوانوں نے اصغر جیسے صاحب فکر و نظر اور بلند مرتبہ شاعر کو بھی اپنے انقلابی تیروں کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ اصغر عہد حاضر کے ان چند شاعروں میں سے ہے جو جدید غزل گوئی کی نمایندگی کرتے ہیں ۔

اصغر کے مقام کا تعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان عام اعتراضات کی روشنی میں اس کے کلام کا مطالعہ کریں جو غزل گوئی پر کئے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر غزل گوئی کو عصر حاضر کے رجحانات کی ترجمانی کے لئے غیر موزوں ثابت کیا جاتا ہے ۔ اگر اصغر ان اعتراضات سے بری ہو جائے اور ان معیاری اصولوں پر پورا اترے جو شاعری کی جانچ پڑتال کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تو ہمارے خیال میں یہہ اہل ذوق کی تسکین کا باعث ہوگا ۔

غزل گوئی پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن میں سب سے بڑا ، اہم اور وزن رکھنے والا اعتراض یہ کہ غزل گوئی کا سرمایہ بہت محدود ہے اور فرسودہ و پامال مضامین کو لفافے بدل بدل کے پیش کرنے کے سوا چارا نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعتراض کافی وزن رکھتا ہے اگر اُردو شاعری کی ابتدا سے اب تک تمام شاعروں کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس قسم کی کمزوری سب میں نمایاں نظر آتی ہے ۔

لیکن اصغر کی شخصیت اس سے کہیں بلند و بالا ہے ۔ اصغر ایک تو مند دل و دماغ کا مالک ہے اور اسی وجہ سے وہ جدت و ندرت تخیل کے لازوال نمونے جبین شاعری کی زینت کے لئے چھوڑا جاتا ہے اور اس میں اس کی شاعری کی صداقت و اصلیت سے چار چاند لگ جاتے ہیں اصغر نت نئے انداز میں وہ پوشیدہ باتیں بیان کرتا ہے جن کی طرف عام دماغ کبھی متوجہ بھی نہیں ہونے پاتا ۔

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں
سو حسن کردں پیدا ایک ایک تمنا سے

آج تک ہم عشق کی بے چارگی اور لاچاری کے بہت سے قصے سنتے رہے اور نوا سنج

اسی کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے رہے۔ کہیں تو سرکار حسن کی درباری میں عشق کی بے کسی کو واضح کیا گیا تو کہیں اس کے یار نہ پانے کی تصویر کھینچی گئی لیکن کسی نے بھی عشق کی عظمت کی طرف توجہ نہ کی۔

اصغر پہلا شاعر ہے جس نے عشق کی عظمت کا راز فاش کیا ہے یہی ایک شعر اُس کی جدت طرازی کے ثبوت میں بہت کافی ہے۔

اصغر نے ایک اور شعر میں "نیاز عشق" کی عظمت، اور واعظ ناداں کو اس انداز میں سمجھایا ہے کہ واعظ جیسے رجائیت پسند انسان کے دل میں بھی احساس بیداری جوش زن ہوتا ہے۔

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبہ جبیں میں نے جہاں رکھدی

شاعروں کی آہ وزاری، نالہ وشیون، اور معاملات عشق کی ناکامیوں کے ماتم سے کان تنگ آ گئے تھے۔ اصغر نے اس گرانی کو اچھی طرح محسوس کیا اور نہ صرف اس نے اس کا اندازہ لگایا بلکہ ایک بہت ہی تیر بہدف نسخہ تجویز کیا ہے جس سے وہ گرانی ختم ہو جاتی ہے۔

رندوں کی عالی ظرفی کا اندازہ لگانے کے لئے ذیل کا شعر ساغر و مینا اور ساقی و میخانہ کے قدیم متعلقات ہی کے ساتھ پڑھئے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اصغر کی طبیعت میں کس قدر اپج اور ندرت ہے۔

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے ۔۔۔ جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے نہایت ہی غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد محبت کا حقیقی اور اصلی راز معلوم کیا ہے۔ یہ سب کچھ اُس کی بلند و وسیع نظر کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عام شاعروں کی طرح انسانی زندگی کی اُن معمولی اور عارضی کیفیتوں پر جو دوسروں کی شاعری کا موضوع بن جاتی ہیں توجہ نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے اور اس حقیقت کی شرح و بسط کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی کی بعض ہنگامی کیفیتوں میں بھی اس قدر درد و اثر ہوتا ہے کہ یہ کیفیت بجائے خود زندگی کا عنوان بن جاتی ہے۔ کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ فانی کی یاسیات کی تبلیغ ہی سے اُس کی عظمت و شان کا اندازہ ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی فانی کی سحر کار زبان اس کیفیت کو جس سے خود شاعر متاثر ہوا ہے سامع پر بھی طاری کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اثر مستقل نہیں جس شدت کے ساتھ انسان رنج و غم کے جذبات سے متاثر ہوتا ہے اتنی ہی جلدی اس کے اثرات بھی مٹ جاتے ہیں جب تک انسان جذبات میں گھرا رہتا ہے اُن سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن جوں ہی کہ بصیرت مل جاتی ہے ان جذبات کی شدت میں کمی ہونے لگتی ہے۔

اصغر کی پرواز شب و روز کے سات آسمانوں سے بھی بلند تر ہے۔ اس لئے اُس کی شاعری کا موضوع کوئی ہنگامی اور موقتی انسانی جذبہ نہیں ہے۔ بلکہ خود کائنات ہے دوسرے الفاظ میں اصغر جزو کی حد بندیوں کو توڑ کر اصل کی سرحدوں تک دھاوا بول دیتا ہے۔ وہ جذبات کو اکسانے کی بجائے احساسات کو بیدار کرتا ہے جب انسان کے احساسات بیدار ہو جائیں تو اُس کی زندگی کا ایک اہم ترین مقصد حاصل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اصغر موقتی ہنگامہ آرائیوں سے قطعاً متنفر ہے اور وہ مستقل حقیقت کی تلاش میں پرواز کرتا نظر آتا ہے۔

کیا دردِ ہجر اور کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

غزل کی ریزہ گوئی بہت کچھ بدنام ہے اور اُس کی یہ بدنامی بے جا بھی نہیں ہے جس غزل کے ہر شعر کا مضمون جداگانہ ہو یہ توقع کرنا عبث ہوگا کہ شاعر کی نظر ایک خاص زاویہ پر لگی ہوگی اور اُس کے سامنے کوئی نصب العین ہوگا یا دوسرے الفاظ میں غزل گو شاعروں کا کوئی ایک مکتبِ خیال نہیں ہوتا جس کی نشر و اشاعت میں وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا سکیں دورِ حاضر میں ہر فعل کا کوئی نہ کوئی مقصد ضروری ہے اور ایسی صورت میں غزل گوئی ادب میں کوئی خاص جگہ پانے کی مستحق نہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ

اصغر غزل گو ہونے کے باوجود اپنا ایک مستقل مسلک رکھتا ہے اور اُس کی شاعری اسی مرکز پر ٹھیری ہوئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کی تنگ دامانی اور ردیف وقافیہ کی جکڑبندیوں کے باعث وہ نظم گو شاعروں کی طرح اس خصوصیت کو نمایاں نہیں کر سکا لیکن یہ اُس کی کمزوری نہیں بلکہ اُس کے اپنے ماحول کا قصور ہے جس سرزمین کے نظم گو شاعروں کو تک نصب العین اور مرکز توجہ میسر نہیں وہاں اصغر جیسے غزل گو شاعر پر اعتراض کی بھی کوئی گنجایش نہیں۔

دور حاضر کے ایک سے زیادہ ایسے نظم گو شاعر ملیں گے جن کی ہر نظم کا مضمون ایک دوسرے سے تضاد رکھتا ہے۔ اگر غزل گو اور نظم گو شاعروں میں کوئی فرق ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ غزل کا ہر مضمون جداگانہ بلکہ بعض وقت متضاد ہوتا ہے اس کے برخلاف نظم گو شاعروں کی ہر نظم کی یہی کیفیت ہے جس طرح نظم گو شاعروں میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند ہی ہیں جو مستقل مسلک رکھتے ہیں اسی طرح اصغر بھی شاید ایک ہی غزل گو ہے جس کے غور وفکر کا ایک مرکز ہے جس کے اطراف اس کی پرواز ہے۔

اصغر زندگی کو جہد و کشاکش سے عبارت سمجھتا ہے اور اُس کی روح کو جو ازل ہی سے پروردۂ طوفانِ آلام و مصائب ہے ساحل کے آغوش میں سکون نہیں ملتا۔ چونکہ اصغر زندگی کے اس بلند و بالا مقصد سے بخوبی واقف ہے اس لئے وہ رنج و غم اور درد و الم کی موقتی کیفیتوں میں کھو نہیں جاتا ہے اور یہی اس کی شاعری کا مقصد وحید ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے

جستجو ہے زندگی ذوق طلب ہے زندگی		زندگی کا راز لیکن دوریِ منزل میں ہے
ایک جہد کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں		کفار کا مٹ جانا خود مرگ مسلماں ہے
آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو		یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

علامہ اقبال کے ذیل کے شعر کی تائید اصغر کے مندرجہ بالا اشعار سے ہوتی ہے۔

موج ساحل کہ در آغوش ساحل		تپید یک دم و مرگِ دوام است

قطع نظر اس سے کہ اصغر نے کس بلاغت وندرت کے ساتھ ان حقائق کو بیان کیا ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اصغر ایک خاص مکتب خیال کا حامی ہے اور قنوطیت کے اثرات سے بالکل ہی غیر متاثر ہے ۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کی زندگی آسایش و اطمینان سے گذری ہے اور ان تلخ کامیوں سے سابقہ نہیں پڑا جس سے انسان کی زندگی کی نشوونما پر ایک اوس سی پڑ جاتی ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کو زندگی کے ہر شعبہ کا عملی تجربہ حاصل ہے اس نے ہر دشت کی سیاحی کی ہے اور کوئی میدان حیات اس سے بچنے نہیں پایا وہ اُن عام قائدین کی طرح بکواس نہیں کرتا جن کی خانگی زندگی کے جمع و خرچ ان کی تقریروں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں وہ عام جلسوں کا بکواسی نہیں بلکہ وسیع تجربہ کا حامل ہے اُس کی شاعری اُس کے اپنے رجحانات اور تجربات کی آئینہ دار ہے چنانچہ اُس نے اپنے تجربوں سے متعلق بار بار اشارہ کیا ہے ۔

بارِ الم اٹھایا رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

چونکہ وہ زندگی کی ان تلخ کامیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہے اس لئے اُس کے ضمیر کا اطمینان اُسے بے اختیار یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ

بنائے درد و الم ۔ درد غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

اصغر سے زیادہ کوئی عشق کی ناکامیوں سے واقف نہیں لیکن وہ آہ و نالہ نہیں کرتا اور نہ اپنی کوششوں سے ہاتھ اُٹھا لیتا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ عمر کا جو حصہ ناکامیوں کی نذر ہوا ہے وہی دراصل عمر کا سب سے کار آمد حصہ ہے

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

سرمایۂ حیات ہے حرمانِ عاشقی
ہے ساتھ ایک صورتِ زیبا لئے ہوئے

ذرا صورتِ زیبا کی حسنِ ترکیب اور اس کے معنوں کی بلاغت پر غور کیجئے۔ ذوق بے اختیار سر دھننے پر مجبور کردیتا ہے، حرمان عاشقی اور اس کے ساتھ "صورتِ زیبا" یہی دو چیزیں ہیں جن کے باعث انسان کا زیست سے نباہ ہو رہا ہے ورنہ کبھی کے زندگی ان تلخیوں کے نذر ہو جاتی

اصغر نے عام غزل گو شاعروں کے خلاف ادب اور شاعری سے متعلق بھی اپنے اشعار میں بلیغ اشارے کئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نہ صرف ایک شاعر ہے بلکہ اس کا ذوقِ نقد بھی بہت سلجھا ہوا ہے۔ اصغر غزل گوئی کی مخالفت سے ناواقف نہیں تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ یہہ بھی جانتا تھا کہ یہہ مخالفت کن بنیادوں پر مبنی ہے چنانچہ اس نے اپنے اشعار کے ذریعے ایک طرف تو مخالفین کے سامنے نہایت متانت و سنجیدگی سے ادب میں صنفِ غزل کے مقام کی طرف اشارہ کیا اور دوسری طرف خود غزل گو شاعروں کے لئے اس نے غزل کا نفسیاتی تجزیہ کرکے اس کے اجزائے ترکیبی کو رکھ دیا تا کہ وہ غلط روی سے باز آجائیں۔ اس طرح اصغر کا بلاشبہ ادب پر ایک بہت بڑا احسان ہے جسے شاید ہی کسی شاعر نے انجام دیا ہو۔

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہئے تجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

غزل کیا؟ ایک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر یہاں افسوس گنجایش نہیں فریاد و ماتم کی

ذیل کا یہ شعر شاعری کی کتنی سچی تصویر پیش کرتا ہے

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

آخری مصرعہ کے تینوں ٹکڑے اپنی جگہ نگینے سے کم نہیں اگر ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو شاعری کا مزہ پھیکا پڑ جاتا ہے اور اس کا وہ اثر جو ان تینوں لوازمات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا باقی نہیں رہتا۔

اصغر نے اپنی شخصیت کی اس طرح عکس کشی کی ہے۔

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا   اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اصغر کی اس بے خودی کے راز کو آشکار کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی شاعری کا نظر تعمق سے مطالعہ کریں اور اپنے آپ پر بھی وہی کیفیت طاری کرلیں۔ جو اصغر پر مسلط رہتی تھی لیکن یہ کام وقت طلب ہے اور یہہ ممکن نہیں کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی شاعری کے تمام روشن پہلوؤں پر بھی تفصیل سے لکھا جائے۔ لگے ہاتھوں اصغر کا ایک اور شعر غزل گوئی سے متعلق سن لیجئے۔

غزل میں درد رنگین تو نے اصغر بھر دیا ایسا   کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

درد رنگین کی ترکیب کی نزاکت اور اس کے معنوں کی لطافت پر بے اختیار داد دینے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔

شاعری نام ہے تخیلی پیکروں کے پیدا کرنے کا (Poetry is the creation of imagination)

لیکن بدقسمتی سے اُردو شاعری اور خاص کر غزل گوئی میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ہمارے ذوق کی تشنگی دور ہو سکے اور اس پر شاعری کی یہہ تعریف صادق آئے لیکن پھر بھی اچھے شاعروں کے کلام میں بت تراشی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور غزل کی تنگ پہنائیوں کے باوجود ایسے واضح تخیلی پیکر پیش کئے گئے ہیں کہ عش عش کرنا پڑتا ہے۔

اصغر کا کلام بھی بت تراشی کا بہترین سرمایہ ہے اور تشبیہ و استعارے کے مناسب انتخاب اور سلامت مذاق نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

یوں تو داغ کے زمرہ میں بہت سے ایسے شاعر ملیں گے جن کے ہاں معشوق کا لازوال سراپا پورے کمال کے ساتھ موجود ہے لیکن ان کے مذاق کی ثقالت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے یا تو کسی قصاب کی دوکان کی تصویر پیش کی ہے یا معشوق کو قتال ثابت کرنے کے لئے اسے میدان جنگ کا ایک بہت ہی وحشت ناک سپاہی دکھایا ہے اصغر کی شاعری ثقالت کی اس گرانی کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ وہ نہ صرف لطیف و حسین پیکر پیش کر کے ہمارے لئے حظ و لذت کا سامان بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس سے ہماری خوابیدہ ذہنی قوتیں بھی بیدار ہو جاتی ہیں۔

اصغر جس طرح خود کسی حسین چیز کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ اس چیز کا

دوسروں کو بھی احساس دلاسکتا ہے اور وہ ہر چیز کے حُسن کو اس نظر تعمق سے دیکھتا ہے کہ اس کے ایسے پہلو جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اس کے ساتھ اصغر کو قوت اظہار بھی بہت غیر معمولی حاصل ہوئی ہے وہ اس لطیف انداز کے ساتھ غیر ضروری تفصیلات میں گئے بغیر مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ احساس تصور پیدا ہو جاتا ہے اور ہر شخص اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق ایک ذہنی پیکر تراش لیتا ہے ۔

تقدیر کس کے خرمن ہستی کی کھُل گئی
طوفان بجلیوں کا تمھاری نظر میں ہے

بکھری ہوئی ہے زلف بھی اس چشم مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

زلف اور چشم مست کی تصویر کو واضح کرنے کے لئے ہلکا سا ابر اور میخانہ کی کتنی جادو اثر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں ۔

نگاہِ یاس و آہِ عاشقاں و نالۂ بلبل — معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُن کے پیکاں کی

لطافت خیال کے ساتھ ذہنی پیکروں کی نظر افروز مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

کیجئے کس طرح دوگانہ سجدۂ نیاز — یہ بھی تو ہوش نہیں پاؤں کہاں ہے سر کہاں

زاہد نے میرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رخ پہ تیری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

دل پر لیا ہے داغ عشق کھو کر بہار زندگی — اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

ہم نے یہ مختصر سا مضمون صرف اصغر کے مقام کو متعین کرنے کی غرض سے لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی شاعرانہ عظمت کے لیے ذیل کے اشعار بہت کافی ہیں۔ آئندہ کسی وقت میں اس کے دیگر محاسن و خصوصیات سے بحث کی جائے گی جو فرصت طلب ہے۔

جستجو ہے زندگی ذوق طلب ہے زندگی   زندگی کا راز لیکن دوریٔ منزل میں ہے

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں   بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

انسان کی تعریف ملاحظہ کیجئے۔

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے   جب مختصر کیا اُسے انساں بنا دیا

دعویٰ دید غلط دعویٔ عرفاں بھی غلط   کچھ تجلی کے سوا چشم بصیرت میں نہیں

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب   بے خودی نے اب اُسے محسوس عریاں کر دیا

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں   تیری صورت میں ہے کیا جو میری صورت میں نہیں

یہ مختصر سا مضمون اپنے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس لحاظ سے ہم نے اس میں صرف انہیں امور سے بحث کی ہے جن سے اصغر اور غزل گوئی پر روشنی پڑتی ہے اور ان انتہا پسند ادیبوں کے لیے سامان فکر بہم پہنچاتا ہے جو چوٹی کے غزل گو شاعروں کے کلام پر بھی تنقید کرتے ہوئے جمالیاتی خوبیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں خود اصغر کا کلام اس امر کا متقاضی ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جائے اور ہمیں یقین ہے کہ ہر صاحب ذوق اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

"رحیم الدین کمال ظہیرآبادی"

اقبال اور مسئلہ جبر و قدر

علامہ اقبال مرحوم کی شاعری کے آخری مدارج ارتقار میں صوفیانہ دپیغمبرانہ جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ اس برگزیدہ ہستی کا ملہمانہ مشن اسرار خودی ورموز بے خودی میں ظاہر ہوا اور جاوید نامہ میں کمال اوج پر جاپہنچا۔ اقبال کا یہی وہ درخشاں دور ہے جس میں وہ اپنے پیام کو باضابطہ اور مکمل صورت میں پیش کرکے معترضین کی دنیا کو بھی ہم آہنگ بنالیتا ہے۔ جاوید نامہ میں اس الہامی شاعر کا مخصوص انداز بیان نہایت ہی دلچسپ اور ایک عظیم الشان تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی یہ مفکر اعظم صوفیوں کی طرح افلاک کی روحانی سیر کر رہا ہے۔ اس طرز بیان کی محرک زیادہ تر وہ مشہور کتاب ہے جسے ایک ہسپانوی عربی کے عالم اسن پلاسیو (Asin Plasios) نے اسلام اور آسمانی طربیہ Islam and Divine Comedy کے نام سے شائع کی تھی۔ مصنف مذکور نے کئی سال کی مسلسل جدوجہد اور تحقیق کے بعد بالآخر یہ ثابت کیا تھا کہ ڈانٹے کے آسمانی طربیہ Divina Commedia کا خاکہ اور جنت و دوزخ و اعراف کے جغرافیائی تفصیلات کا سرچشمہ زیادہ تر مذہب اسلام ہی ہے۔ چنانچہ وہ ان میں سے تین اہم باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ (۱) معراج کے متعلق الہامی عقائد و روایات۔ (۲) ہسپانوی صوفی محی الدین العربی (۱۲۴۰ - ۱۱۱۴) کا معراج جنھوں نے خود بہشت میں اپنے روحانی سفر کا ذکر کیا ہے۔ (۳) اسی قسم کے ایک اور سفر کا تذکرہ جسے ایک عربی شاعر ابوالاعلی معری (۹۷۳ - ۱۰۵۷) نے اپنے رسالہ رسالت الغفران میں کیا ہے۔

اقبال نے ان تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ اور اس کا طائر خیال اب آسمانوں کی سیر

کرنے لگا۔ اس کے مذہبی یا متصوفانہ تصور پر خالص ادبی رنگ غالب ہے۔ اور وہ ایک ایسا دلچسپ فلسفیانہ خواب دیکھ رہا ہے جو اسی کے ذوقِ فکر اور تمنائے پرواز کا نتیجہ ہے۔ مولانا رومیؒ اس کے خضرِ راہ ہیں جن کی رہبری میں وہ چھ اجرام فلکی یعنی قمر، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، اور زحل کی سیر کرتا ہے۔ اس دوران میں زمانہ ماسبق کی ان متعدد روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جن میں شعراء، مدبر، مفکر، مصلح، اور دیگر اشخاص کا ایک گروہ شامل ہے۔ یہ شاید پہلی کوشش ہے جس کی فارسی زبان رہینِ منت ہے۔ اور اس کوشش کا حاصل جاوید نامہ ہے جو بلحاظ نام واقعی ایک لازوال کتاب ہے اس کتاب سے اقبال کو یہ توقع تھی تو کوئی بیجا نہ تھا کہ جس طرح آسمانی طربیہ سے یورپ میں روشن خیالی کا دور شروع ہوا اسی طرح یہ گنجینۂ افکار بھی نئی نسلوں کے لئے حرزِ جان اور سرچشمۂ فیضان بن جائے گا۔ کیونکہ

اس میں اقبال کا موضوعِ بحث زیادہ تر حیاتِ اخروی نہیں بلکہ یہاں کی موجودہ زندگی ہے۔ اقبال کے خیال میں زندگی ابدی و غیر فانی اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ موت ایک وقفہ ہے ہماری ابدی زندگی کا اور اس قدر عارضی کہ وہ ہستی کے وسیع سمندر میں موج کی طرح گم ہوجاتا ہے۔ ہماری موجودہ زندگی ذوقِ حیات کا ایک ادھورا نقشہ ہے جو موت کے بعد ہماری آئندہ رفتار زندگی کا تعین کرتا ہے۔ اس لئے موت ہماری زندگی کو کامل بنانے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ؎

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی (اقبال)

مسئلہ تقدیر:۔

فلکِ مشتری پر اقبال حلاج اور غالب کی روحوں سے ملاقات کرتا اور مذہبی فلسفہ کے متعلق ان سے شرفِ تکلم حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف ایک مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے۔ اقبال تقدیر اور اس کے متعلقہ سوال شر کی تعبیر کس طرح کرتا ہے۔ نیز اس کے نزدیک حیاتِ انسانی میں انا، کیا قدر و قیمت رکھتی ہے؟

مسلمانوں کے مذہبی ادھیڑبن اور غور وفکر کی ابتدائی تاریخ میں تقدیر کا مسئلہ اوّل اوّل بہت کچھ معرض بحث میں آیا۔ معتزلہ (عقلیت پسند گروہ) اس نظریہ کا حامی تھا کہ انسان کو اپنے افعال میں مطلق اختیار حاصل ہے۔ اس طرح یہ گروہ اس فیصلہ پر پہنچا کہ نیکوں کے لئے بہشت کی بیش بہا نعمتوں اور بروں کے لئے جہنم کی دوامی مصیبتوں کا وجود لازمی ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال پر قادر ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ لیکن ذرا نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کے بہت سے افعال ایسے ہیں جن پر اس کا قابو نہیں چلتا۔ علاوہ بریں مطلق آزادی کے اس عقیدہ میں خدا کے علم کاملہ اور قدرت مطلقہ کو محدود کردینے کا شائبہ پایا جاتا ہے لہذا اشعریہ نے کہا خدا اپنے افعال میں بالکل آزاد ہے اور یہ واجب نہیں ہے کہ وہ کسی قانون کی پابندی کرے۔ سزا و جزا کے بارے میں انھوں نے کسب کا نظریہ پیش کیا ہے۔ لیکن بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ یہ نظریہ غیر منطقیانہ ہے اور اس سے ہماری ٹھیک رہبری نہیں ہوتی نیز اس کے سارے دینیاتی اصطلاحات کو درگذر کردیا جائے تو یہ بجز خالص جبریت (Determinism) کے اور کچھ نہیں رہتا۔

ارادہ کی خودمختاری کی زیادہ معقولانہ تائید مولانا رومؔی ہی کے حصّہ میں آئی۔ ان کے خیال میں انسان کے اندر نیکی یا بدی میں بے باکانہ انتخاب کی قوت پائی جاتی ہے اور یہی قوت انسان کو دیگر مخلوقات سے ممیز کرتی اور اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کرتی ہے۔ قوانین فطرت بلاشبہ پہلے ہی سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ لہذا ناقابل تبدیل ہیں لیکن انسان کا حق انتخاب پہلے ہی سے متعین نہیں ہوتا۔ انسان جب کسی خاص محل یا موقع میں ہوتا ہے تو خود اسے اپنا راہ عمل متعین کرنے کی آزادی حاصل رہتی ہے۔ لیکن جوں ہی وہ اپنا راہ عمل متعین کرلیتا ہے تو بے رحم قانون فوراً عمل پیرا ہوجاتا ہے۔ تب فرد اپنے فیصلہ کے مطابق اپنے افعال کا ثمر حاصل کریگا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ پھل اچھا ہے یا برا۔ ظاہر ہے کہ نشہ کی حالت میں ہوشمندی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے! بارش کا ہونا یا نہ ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن انسان اپنی عقل سے کام نہ لے کر وقت پر

کاشت نہ کرے اور معقول کھاد سے زمین کو زرخیز نہ بنائے تو بارش کے باوجود بھی نتیجہ معلوم ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کے سپید و سیاہ میں ہمارا کوئی دخل نہیں ۔ کائنات کا ذرہ ذرہ کسی قادر مطلق کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرنے پر مجبور ہے اِنَّ اللہ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ ۔ اسی مضمون کو اقبال اس طرح باندھتا ہے ۔ ؎

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہیں شمس و قمر مجبور ہیں — انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچہ کا سبو گلزار میں — سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں

لیکن انسان کی ذات دیگر مخلوقات سے بالاتر ہے ۔ اسے ارادہ کی خودمختاری حاصل ہے ۔ لیکن وہ اپنے افعال پر بہت کم قادر ہے اس کے اختیاری افعال کی وسعت کا اندازہ اس مثال سے کیجئے ۔

ایک شخص کو اختیار ہے کہ وہ کسی دوسرے کو قتل کردے لیکن دوبارہ زندہ کرنا اس کے امکان سے باہر ہے ۔ گویا انسان کچھ تو مختار ہے اور کچھ مجبور ۔ زیادہ صریح الفاظ میں انسان "مقید مختار" ہے ۔ جو شخص اپنے اختیاری افعال میں تقدیر پر تکیہ کرتا ہے ۔ اسے اقبال نباتات و جمادات کی صف میں کھڑا کردیتا ہے ۔ ؎

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام ؟ — حل اس کا نہیں مشکل اے مرد خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر — ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اس سے ظاہر ہے کہ خود انسان اپنے ستارۂ قسمت کو اپنے اندر لئے پھرتا ہے کوئی ارضی و سماوی اثر اس کے راہ عمل کو متعین نہیں کرسکتا ۔ مولانا رومیؒ شر کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ کیفیات قلبی کی ممکن صورتوں کو عمل میں لانے کا ذریعہ ہے یعنی شر امکانات نفسی کو حقیقت سے بدل ڈالنے کا ذریعہ ہے ۔

انیسویں صدی عیسوی کی طبیعات نے قانون علیت اور اصول میکانیت پر نا واجب زور دیتے ہوئے زندگی کے جبری نظریہ کی موافقت کی تھی لیکن جدید انکشافات فی الحال اس نقطۂ نظر کو کم از کم زائل کر دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مادی کائنات کے صحیح مطالعہ کے لئے اب علیت پہلا سا معیار تنقید نہیں رہا۔ اور نہ میکانیت کوئی معقول استدلال پیش کر سکتا ہے تاکہ اسے قانون لاقدریت (یہ فلسفیانہ عقیدہ کہ انسان کے افعال کلی طور پر محرکات سے متعین نہیں ہوتے) کے مدمقابل کھڑا کیا جا سکے۔

(ملاحظہ ہو ریا ٹنگٹن کی کتاب طبعی دنیا کی ماہیت باب علیت)

اس مسئلہ کے متعلق سب سے اہم مضمون برگسان (Bergson) کا ہے۔ برگسانی فلسفہ کی رو سے حقیقت خود متغیر بھی ہے اور باعث تغیر بھی۔ اس کا یہ تغیر مسلسل و دوامی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ حیات بھی اسی فلسفہ کے مماثل ہے۔ اس یہودی فلسفی برگسان نے بالکل نئے زاویہ سے اس مسئلہ تک رسائی کی ہے۔ یہ نئی رسائی تصور زمان پر موقوف ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہمارا ہر زمانی تصور بہت زیادہ تصور مکان میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہم وقوع میں آتے ہوئے واقعات کو بعینہٖ پیش کرتے ہیں تو کسی خاص تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہیں اور زمان کو مکان میں پھیلی ہوئی ایک لکیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس لکیر کو کاٹ کر ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کر دیتے ہیں تصور زماں کا یہ خارجی (Objective) طریقہ دراصل زینو (Zeno) کے مشہور استبعادات کا نتیجہ تھا۔ زماں کی سچی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو ہمیں موضوعی (Subjective) نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم کو شعوری تجربہ کی رہبری حاصل کرنی چاہیئے۔ لیکن ہم اپنے روزمرہ کی مقررہ فعلیتوں میں اس طرح مستغرق رہتے ہیں کہ سطح سے نیچے گہرائیوں میں نہیں پہنچ سکتے۔ گہرے مراقبہ کے چند لمحات ہی ہم کو اس قابل بناتے ہیں کہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ برگسان کے خیال میں حقیقت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کا مسلسل تغیر ہی زمانی و مکانی تعینات کا باعث ہوتا ہے۔ زمانی و مکانی تعینات اس کے دائمی تغیر کی سطحی حالتیں ہیں جس کا ادراک شعور کی گہرائیوں میں داخل ہونے سے

حاصل ہوتا ہے۔ برگسان کے الفاظ میں

"میں ایک حالت سے دوسری حالت پر آتا ہوں۔ مجھے سردی ہوتی ہے یا گرمی، میں مسرور رہوں یا مغموم، محوِ کار رہوں یا نہیں، میں قریب کی اشیاء پر نظر ڈالتا ہوں یا کسی بات پر غور کرتا ہوں۔ تحریکات واحساسات، قوتِ ارادی ومنصوبے۔ ایسے تغیرات ہیں جن پر میرا وجود منقسم ہے جس کو وہ تغیرات باری باری رنگتے رہتے ہیں تو گویا میں متواتر بدلتا رہتا ہوں۔"

(ملاحظہ ہو برگسان کی کتاب "تخلیقی ارتقاء")

اقبال بھی برگسان کا ہمنوا ہے ؎

فریبِ نظر ہے سکون وثبات ۔ تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ۔ یہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

دوسری جگہ اقبال یہ بتانا چاہتا ہے کہ مسلسل تغیر ہی زمانی ومکانی تعینات کا باعث ہوتا ہے

سلسلۂ روز وشب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز وشب اصلِ حیات وممات

سلسلۂ روز وشب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز وشب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر وبم ممکنات

خارجی نقطۂ نظر سے ہم تو ہم تصور کرتے یا پھر متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف کیفیات کا سلسلہ اس طرح پیہم جاری رہتا ہے کہ گویا وہ کیفیات مکاں میں ایک دوسرے کے بازو یا دوش بدوش واقع ہیں۔ لیکن حقیقی تغیر کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ احوال شعور ایک دوسرے کے باہر نہیں بلکہ ایک دوسرے میں متداخل ہیں۔ اور کُل غیر منقسم شعور پے در پے متغیر ہوتا رہتا ہے۔ حقیقی تغیر میں احوال بالکل نہیں ہوتے ہر چیز حاضر، موجود، اور متحرک رہتی ہے۔ خالص استمرار (Duration) ہی حقیقی زمان ہے۔ یہ سلسلہ نہیں بلکہ جان یا شعور کی طرح ایک وجود ہے جس میں اب (اس حالت میں) ساری حقیقت فی الواقع موجود، متحرک اور متغیر ہے۔ یہی واحد "اب" خالص استمرار ہے۔

جیسے ہم "ابون" (nows) کے سلسلۂ متواترہ میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

جوں ہی استمرار کا یہ تصور ہمارے اوراک میں آجائے ارادہ کی خود مختاری کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جان اور شعور (طبعی سائنس کے مادی اجسام نہیں کہ ان کو ناپ تول لیا جائے ان سے محض مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے ذی حیات فرد میں جذب اور سرایت کرنیوالی قابلیتیں ہیں جو راہ ترقی پر گامزن ہے اور جس پر کسی قانونِ میکانیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد کے افعال تخلیقی ہوتے ہیں لہذا ایسے افعال ارادہ کی مختاری سے عمل میں آتے ہیں ارادہ کی مختاری یا آزادی صلاحیتِ تخلیق کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے شعور میں کسی حالت کی تکرار نہیں ہوتی لہذا زمان حقیقی میں ہمارے وجود سے مراد تخلیق کرنا اور آزاد رہنا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق و تخلیق ہی زندگی ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ تم اگر زندگی چاہتے ہو تو عاشق خلاق بنو اور اس طرح کائنات میں اپنی حکمرانی کا سکہ چلاؤ۔ جو شئی ساز گار نہیں اسے مٹا کر اپنے ہی ضمیر کے اندر سے ایک نئی دنیا کو پیدا کرو کیونکہ آزاد انسان کو دوسروں کی دنیا میں جینا ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ ؎

جہان عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اقبال کے نزدیک جو مسلمان خلاق نہیں وہ مومن نہیں بلکہ کافر و زندیق ہے۔ ؎

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان　　مومن ہے تو وہ آپ ہی تقدیر الٰہی

اس لئے اقبال کہتا ہے۔ جمالِ یار کا یہ تقاضا ہے کہ تم شمشیر کی طرح تیز (حساس) بنو اور اپنے جہان کی تقدیر بنو۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اقبال "ندائے جمال" کو رنگ تغزل چڑھا کر اس طرح نغمہ سرائی کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۲۵)

کلکِ حق از نقشہائے خوب و زشت　　ہر چہ مارا ساز گار آمد نوشت

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب　　از جمالِ ذات حق بردن نصیب

آفریدن ؟ جستجوے دلبرے　　وانمودن خویش را بر دیگرے

ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود — بے جمالِ ما نیاید در وجود
زندگی ہم فانی و ہم باقی است — ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندۂ ؟ مشتاق شو خلاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آں را کہ ناید ساز گار — از ضمیر خود دگر عالم بیار
بندۂ آزاد را آید گراں — زیستن اندر جہانِ دیگراں
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست — پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
از جمالِ ما نصیب خود نبرد — از نخیلِ زندگانی بر نخورد

مردِ حق ! برندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

تقدیر کیا ہے اقبال کے الفاظ میں " خالص زماں ایک ترکیبی کل (Organic whole) ہے جس میں ماضی پیچھے نہیں چھوٹ گیا ہے بلکہ حال کے ساتھ ساتھ متحرک ہے اور اس کے اندر اندر عمل پیرا ہے ۔ نیز مستقبل آگے کی طرف پڑا ہوا نہیں ہے کہ ہنوز اس پر سے گذرنا ہوتا ہے بلکہ یہ اپنی ماہیت میں ہمارے ادراک کے اندر بہ حیثیت ایک نمایاں امکان کے پایا جاتا ہے ۔ یہی زمان جسے قرآن کریم تقدیر کا نام دیتا ہے ترکیبی کل سمجھا گیا ہے ۔ زمانِ ماقبل افشائے امکانات تقدیر ہے ۔ یہ زمانِ تخیلی ہے نہ تخمینی بلکہ احساسی ہے ۔"

(ملاحظہ ہو" اقبال کے چھ لکچرز" صفحہ ۶۷ لاہور اڈیشن)

اعلیٰ جبریت ہماری آزادی سے یہ مطلب نہیں لیا جاتا کہ ہمارے افعال غیر مشروط ہیں بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کسی خارجی شرائط کے پابند نہیں ہیں ۔ شرائط خود ہماری سیرت میں ہوتے ہیں ۔ بعض لوگ تو سیرت ہی کو تقدیر کا نام دیتے ہیں ۔ کیونکہ سیرت انسان کے فطری خواہشات اور افعال سے ترکیب پاتی ہے ۔ اس لحاظ سے اگر کوئی شخص ڈاکوؤں کے گھر پیدا ہوا ہو اور اس نے اسی ماحول میں پرورش پائی ہو تو

ظاہر ہے کہ وہ بھی بڑا ہو کر ڈاکو ہی بنے گا۔ اب اگر سیرت کو تقدیر مان لیا جائے تو خدا ہی پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے کیوں اس شخص کو ڈاکوؤں کے گھر پیدا کیا ہے۔ لیکن فرعون کے گھر موسیٰؑ اور بت پرست کے گھر حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سیرت ہی تقدیر نہیں ہوسکتی۔ سیرت ہمارے افعال کو مشروط ضرور بنادیتی ہے لیکن ہمارے حقِ انتخاب کو سلب نہیں کرلیتی۔

اس طرح گویا ہم زندگی کے ادنیٰ منزلوں میں جبریت سے نکل کر شریت کے ایک ایسے درجہ پر آتے ہیں جہاں آزادیٔ انتخاب کے حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ لیکن اب بھی ارتقاء کی ایک اعلیٰ ترمنزل رہ جاتی ہے جسے ہم اعلیٰ جبریت (Higher Determinism) کہہ سکتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر مختار انسان کو اپنے حقِ آزادی سے دست بردار ہوجانا پڑتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس کے متعلق خدا کہتا ہے "باتو ما سازیم تا با ما بساز" یہی وہ مقام ہے جسے قرآن ایمان کا نام دیتا ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں آکر انسان احکام آلٰہی کی پابندی پر مجبور ہوجاتا ہے لیکن یہ نتیجہ ہے عشق کا نہ کہ جبر کا۔ بیرونی دباؤ یا جبر آزادی کو بالکلیہ سلب کرلیتا ہے لیکن خود کا عائد کردہ جبر عشق و محبت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور تسلیم و رضا عشق کی پائیداری کے لئے ازبس لازمی ہے۔ اقبال حسن و عشق کی دنیا کو ایک عظیم الشان قوت اور حیاتِ انسانی کی ایک اہم ترین ضرورت سمجھتا ہے۔[۵]

عشق مکان و مکین عشق زمان و زمیں　　عشق سراپا یقین اور یقین فتح باب

یہ معاملہ لطیف ترین تجربہ پر مبنی ہے۔ اس سے مستقل اور پائیدار یقین پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ انہی ارفع و اعلیٰ ہستیوں کا کام ہے جن کے دل عشق و ہمت میں لوہے کی طرح مضبوط ہیں۔ منصور حلاج کا مشہور نعرہ انا الحق (میں تخلیقی صداقت ہوں) اور امیر معاویہؓ کا قول "میں تقدیر ہوں" — ایسی چند مثالیں ہیں جو اس قسم کے عظیم ترین مذہبی تجربہ کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن اعلیٰ جبریت کا ایسا تجربہ خودی کے سلبی یا منفی نظریہ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ یہ اثبات انا کا ایسا عظیم ترین دعویٰ ہے کہ اس سے راستہ میں حائل ہونے والی ساری رکاوٹیں ہیچ معلوم

ہونے لگتی ہیں۔ اثباتِ خودی کا بے باکانہ اعلان ہی اقبال کی شاعری اور فلسفہ کی جان ہے۔
اور اسی سے وہ سارے مسائل کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔

فلک مشتری پر اقبال اثنائے گفتگو میں مسئلہ تقدیر کو اس طرح چھیڑتا ہے

گردشِ تقدیر مرگ و زندگی است　　　کس نداند گردشِ تقدیر چیست

اور خود ہی حلاج کے روپ میں اس مسئلہ کو یوں حل کرتا ہے۔

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ　　　لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ
جبر دین مرد صاحب ہمت است　　　جبرِ مردان از کمالِ قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر　　　جبر مرد خام را آغوشِ قبر!
جبرِ خالد عالمے برہم زند　　　جبر ما بیخ و بنِ ما بر کند
کارِ مردان است تسلیم و رضا　　　بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا
کارِ ما غیر از امید و بیم نیست　　　ہر کسے را ہمت تسلیم نیست
اے کہ گوئی بودنی ایں بود، شد　　　کارہا پابند آئین بود، شد
معنئ تقدیر کم فہمیدۂ!　　　نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مرد مومن با خدا دارد نیاز　　　"باتو ما سازیم تا با ما بساز"
عزم او خلاق تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است　　　جاوید نامہ (۱۴۲۔۱۴۱)

اعلیٰ جبریت صاحبِ ہمت انسان کا دین ہے۔ یہ قوتِ روحانی کا ثمر ہے سالک کا علم اور تجربہ حواس کا غلام نہیں ہوتا بلکہ وہ عشق اور روحانی قوت کے ذریعہ انتہائی حقیقت کو جان لیتا ہے۔ عشق ہی نے موسیٰ کو کلیم اللہ بنا دیا۔ اسی لئے۔ ؎

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں　　　اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام

اسی کی بدولت منصور بھی انا الحق کا نعرہ لگاتا ہوا اللہ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اعلیٰ جبریت

نے کئی دفعہ قانونِ فطرت کو توڑ دیا اور پر اسنے نظمِ عالم کو درہم برہم کر دیا۔ چنانچہ معجزات و کرامات اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ایمان والے خدا سے مستقل راہ و رسم رکھتے ہیں (جو کہتا ہے) "ہم تم سے اتفاق کرتے ہیں تم ہم سے اتفاق کرو" اسی لئے اقبال کہتا ہے۔ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایمان والے خلّاق کا عزم و ارادہ ہی خدا کی عین تقدیر ہے۔ ؎

مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

خیر و شر چونکہ شر کا سوال اس مسئلہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے اس لئے اقبال اس کو آدم علیہ السلام کے واقعہ کا قرآن مجید سے حوالہ دیکر اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس واقعہ کے ۲ دو پہلو ہیں :-

(۱) جب آدمؑ ایک مختار شخص کی حیثیت میں نمودار ہوئے تو وہ جانوروں کی سی وحشیانہ حالت میں تھے۔ ان میں اپنے متعلق غور و فکر، تخمین و ظن اور شک و شبہ کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کا نام نہاد تنزل اصل میں انسانی ارتقار کا اعلیٰ درجہ سے ادنیٰ درجہ پر تنزل نہیں تھا بلکہ ان کے اس واقعہ سے حیات انسانی میں اور بھی رنگینی و ذوق نمو پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ابلیس جبرائیل سے اس طرح مخاطب ہے۔ ؎

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے   قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

آدمؑ کو اپنے افعال کے انتخاب کے لئے شعوری آزادی عطا کی گئی تھی۔ انہوں نے اگرچہ عدول حکمی کو منتخب کیا لیکن یہ آزادیٔ انتخاب کا پہلا فعل تھا جو انسان سے سرزد ہوا اس کی یہ صلاحیت خطرہ سے بھری ہوئی ہے کیونکہ وہ برائی کا بھی انتخاب کر سکتا ہے۔ لیکن خدا نے اس پر کامل بھروسہ رکھا اور اسے آزمائش کے لئے چھوڑ دیا۔ پس ہمارا یہ فریضہ ہے کہ اس کے اعتماد کو حق بجانب ثابت کر دکھائیں۔ قرآن کے الفاظ میں

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ = البتہ تم آزمائے جاؤ گے مال سے اور جان سے

انسان ایک عقلی اور سماجی حیوان ہے۔ وہ اپنی عقل سے قریب و بعید کی چیزوں پر غور وفکر کرتا اور ان کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جانوروں کے جملہ افعال ان کے فطری میلان اور جبلت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان ماضی حال اور مستقبل کے متعلق سوچتا ہے۔ لیکن عقل انسانی چند باتوں کو معلوم کرکے سیر نہیں ہوتی۔ وہ آسمانوں اور زمینوں میں پرواز کرکے اشیاء کی ماہیت کے عام سے عام قوانین دریافت کرنا چاہتی ہے ؎

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

حصول علم کے لئے کھوج و جستجو انسان کا فطری جذبہ ہے اور اسی سے کارخانہ عالم میں اُجالا پیدا ہوتا ہے۔ ؎

یہ تلاش متصل شمع جہان افروز ہے توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے

لہٰذا آدمؑ کی فطری ساخت ایسے علم کے لئے موزوں تھی جو عرصہ دراز کی مستقل جانفشانیوں اور محنتوں کے بعد حاصل ہوا ہو۔ محنت و جد وجہد میں لذت پانے والے انسان کو ابلیس نے فریب سے اکسایا کہ وہ اس درخت کا پھل کھائے جو علوم مخفیہ کی علامت ہے اور جو حصول علم کی قریبی راہ ہے۔ یعنی اس پھل کے استعمال سے تمام رازہائے سربستہ افشا ہوجائیں گے۔ اس طرح شیطان نے دہوکہ سے انسان کے فطری ارتقائے خودی کو روک دینے کی کوشش کی۔ اسی لئے اقبال کہتا ہے کہ رکاوٹوں کا نام ہی شیطان ہے اور ان پر قابو پانے کا نام زندگی ہے۔

الغرض جب انسان ایک دفعہ فریب میں آچکا تو خدا نے شیطان کو نیچا دکھانے کی ٹھان لی اور انسان کو ایک ایسے ماحول میں رکھ چھوڑا جو اگرچہ تکلیف رساں ہے۔ تاہم اس میں ارتقائے خودی کے لئے مناسب ترین مقام حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے حصول کی توقع سے پہلے انسان کو بے حد کشمکش اور جد وجہد کرنی پڑتی ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۝ البتہ ہم نے (خدا) انسان کو محنت میں پیدا کیا۔

کوشش اور جد وجہد کے دوران میں انسان کو رکاوٹوں اور غلطیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

علاوہ بریں بشریت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ غلطی کرے۔ غلطی و تجربہ ہی کے ذریعہ ہم اخلاقی و روحانی قدر و قیمت کے معیار میں اونچا مقام پا سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ ہمارے ذہن کو خطا نہیں یا ہمارے ذہن میں خطا نہیں کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ

اَلْاِنسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الخَطاءِ نِسْیَانَ ۔ پس

(ب) "خیر و شر باوجود ضدین ہونے کے ایک ہی کُل میں واقع ہونے چاہئیں"

انا کی قدر و قیمت آدمؑ کے واقعہ کا دوسرا پہلو انسان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے جس میں وہ موت کی معدوم کر دینے والی ضرب کو افزائش نوع انسانی کے ذریعہ جھانسا دیکر نکل جانا چاہتا ہے۔ لیکن نئی ذاتیں جو طلب علم و تسلط کی خواہش لیئے ہوئے پیدا ہوتی ہیں دوسری ذاتوں کے ساتھ لازماً برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ جس کا نسلِ انسانی کو عرصہ دراز سے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اقبال کی نظر میں ہر ذات کی زندگی کا انحصار کامیاب "تنازع للبقا" میں ہے چنانچہ وہ ذی حیات مخلوق جو کروڑ ہا سال کی متواتر جنگ کے دوران میں اپنی نسل کو برقرار رکھ سکیں اب تک زندہ ہیں۔ اور وہ عضوئے جن میں یہ اہلیت نہ تھی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح معدوم ہو گئے اقبال کسی معاملہ میں انتہا پسند نہیں ہے۔ وہ لامارک اور ڈارون کی طرح "بقائے اصلح" کی بھی وکالت کرتا ہے۔ ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اقبال کے خیال میں وہ اقوام جو جامد ہیں معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وہ جو زندگی کی مسلسل دوڑ میں تیز گام ہیں برقرار رہ سکتے ہیں۔ ؎

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی

اس طرح اقبال کائنات میں شر کے وجود کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں کے

خیال میں خیر زیادہ اور شر کم ہے اور بعض اس کا برعکس سمجھتے ہیں۔ لیکن اقبال متوازن صورت کا حامی ہے۔ اس کے خیال میں خیر و شر برابر پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی اختیار، کوئی تخلیقی فعل اور ارتقائے انسانی کی نشو و نما میں کوئی ترقی نہیں ہوسکتی ہمارا راستہ جتنا کٹھن اور دشوار ہوگا اتنا ہی حظ ہم اس کو عبور کرنے میں حاصل کریں گے۔ اقبال کے خیال میں خودی ہمیشہ حالتِ تعمیر سے گذرتی رہتی ہے۔ اور وہ بہت سے پوشیدہ طاقتوں اور نامعلوم امکانات کا خزانہ ہوتی ہیں رکاوٹیں نئی صلاحیتوں کو سطح پر لے آتی ہیں۔ لہٰذا اُس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ فرد تمام معرکۂ خیر تجربوں میں اپنے آپ کو ڈالدے۔ اقبال اس معاملہ میں رجائیت پسند نہیں۔ وہ شر کے وجود کو حقیقت کا درجہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدمی قرآن کے لفظوں میں "آزاد شخصیت کا امین ہے" اور یہ شخصیت اسی وقت ابھر سکتی ہے جبکہ وہ رنج و الم، لذت و مسرت شور و شغب اور ہنگامہ و کشمکش سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اقبال فلک مشتری کا سفر "نالۂ ابلیس" پر ختم کرتا ہے۔ ابلیس خدا سے آہ و فریاد کر رہا ہے "انسان کیا ہے! محض ایک مشت خاک! میں اس کی ماہئیت سے بخوبی واقف ہوں۔ میری ایک چنگاری بھی اس کو خاکستر بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

اے خدا! ایسے انسان کو پیدا کر جو مجھے خاطر میں نہ لاسکے۔ جو مجھ پر قابو پاسکے جس کی نظریں مجھے لرزہ براندام کرسکیں۔ اور جو مجھے شکست کا اچھا مزہ چکھا سکے۔"

ابن آدم چیست؟ ایک مشتِ خس است مشتِ خس را یک شرار از من بس است
منکر خود از تو می خواہم بدہ سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچید گردنم لرزہ انداز د نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو آں کہ پیش او نیرزم با دو جو
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست لذتے شاید کہ یابم در شکست

اقبال کے خیال میں خدا اسی مشتِ خاک سے ابلیس کو شکست دینا چاہتا ہے کیونکہ یہی انسان سارے موجودات کا مکمل نمونہ ہے۔ اور وہ شر کا مقابلہ کرنے اور اس پر فتح پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ انسانی میں انا (Ego) بے حد قدر و قیمت رکھتی ہے۔

بہرحال یہ ہمارا اہم فریضہ ہے کہ شر کا مقابلہ ہمت و استقلال کے ساتھ کریں۔ اور اپنی شخصیت کے اعلیٰ ترامکانات کو حقیقت کا جامہ پہنائیں۔ اقبال قنوطیت، قسمت سے شکوہ سنجی اور یاس کی زندگی کو بالکل پسند نہیں کرتا اور نہ وہ اس چیز کو پسند کرتا ہے کہ انسان ارادہ کی خودمختاری سے بے جا فائدہ اُٹھا کر اپنے مالک حقیقی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے۔ عشق ہی انسان کو اس قسم کی جراتِ بیجا سے باز رکھ سکتا ہے۔ ورنہ کیا یہ اختیار ہی کا نتیجہ نہیں ہے کہ ہم میں بہت سے دہریے و فرعون ہیں تو بہت سے باغی و سرکش؟ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کو کلام الٰہی بہانگ دہل آگاہ کر رہا ہے:-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝ — البتہ ہم نے انسان کو محنت میں پیدا کیا

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ — کیا وہ سمجھ رہا ہے کہ وہ کسی کے قابو میں نہ آئیگا

(ملاحظہ ہو سورۃ البلد) اسی سورہ میں آگے لکھا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ — اور اس کو دونوں رستے (نیکی و بدی کے) بھی بتا دیئے

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ — پھر بھی وہ گھاٹی (نیکی) میں نہ بیٹھا (نہ گھس پڑا)

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ — اور تو کیا جانے کہ گھاٹی کیا ہے۔

یہاں گھاٹی سے مراد نیکی ہے۔ انسان کو نیکی و بدی دونوں کے راستے قرآن کریم نے بتلادیئے ہیں۔ لیکن نیکی کی راہ چلنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ گھاٹیوں میں سے گذرنا مشکل ہے۔ انسان کو ایسے حالات میں پیدا کیا گیا ہے جہاں محنت و مشقت ناگزیر ہے اور انسان کا خاصہ بھی یہی ہے کہ وہ متواتر جد و جہد میں لذت و مسرت حاصل کرتا ہے۔ اب اگر وہ تقدیر کے

سہارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے یا پھر قدرت کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اس کا ایسا ہی ثمر پائیگا اقبال اسی چیز کو فلسفہ کی رو سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے ۔

چونکہ خود حقیقت متحرک، متغیر اور کون و فساد کا مرکز ہے و نیز تغیر پیہم ہی زندگی ہے ۔ اس لئے وہ مخلوق جو جد و جہد متصل اور کوشش پیہم کو اپنا نصب العین اور مقصدِ حیات نہ بنائے حقیقت کی خلاف ورزی کرتی ہے ۔ لہذا قدرت سے جنگ کرنا اور منشائے حقیقی سے اختلاف کرنا فنا کا پیش خیمہ ہے"۔ اسی لئے اقبال اپنے سارے کلام میں شائقین حیات کو دعوتِ عمل دیتا ہوا نظر آتا ہے ۔ حسب ذیل اشعار اوپر کی ساری بحث کے آئینہ دار اور ماحصل ہیں ے

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام آلہی کا ہے پابند

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نوٹ ۔ اس مضمون کا بیشتر مواد بشیر احمد صاحب دار ایم ۔ اے (لاہور) کے انگریزی کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا ہے فقط

محمد داؤد خان متعلم سال سوم (عثمانیہ)

شکستِ حُسن

(براؤننگ کی نظم "پورفیریا کا عاشق" پڑھنے کے بعد)

آج تک یاد ہے برسات کی وہ رات مجھے　　جب برستی تھی اُداسی مرے کاشانے میں
ٹمٹماتا سا خمِ طاق میں تھا ایک چراغ　　جیسے تاروں کا دھندلکا کسی ویرانے میں
ایک گوشے میں بہکتا ہوا میں بیٹھا تھا　　کھویا کھویا کسی بھولے ہوئے افسانے میں
دلِ بیتاب کو تھوڑی سی تسلی دیتا　　کیف اتنا بھی نہ تھا زیست کے پیمانے میں
ایک ماتم سا تھا ناکام تمناؤں میں　　کہ یکایک وہ در آئی مرے غمخانے میں

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی　　پرچمِ زلف کو رخسار پہ لہراتی ہوئی
نئے انداز، نئے رنگ، نئی شوخی سے　　اک ڈوپٹے کو ذرا دوش سے ڈھلکاتی ہوئی
سایے پھیلاتی ہوئی اوٹ سی مژگانوں کے　　پھول ہونٹوں کے چمن زاروں سے برساتی ہوئی
آنکھ کے طور سے تخلیقِ تجلّی کرتی　　فرق کے نور سے ہر ذرّے کو چمکاتی ہوئی
آئی اور بیٹھ گئی آ کے مرے پہلو میں　　اپنے بالوں کو مرے دوش پہ بکھراتی ہوئی
عطر میں ڈوبی ہوئی سانس کے ہر جھونکے سے　　گلشن روح کے ہر پھول کو مہکاتی ہوئی
اپنی باہوں کے حسیں لوچ کی ہر لرزش سے　　میرے تخئیل کی امواج کو بہکاتی ہوئی
مجھ سے دم بھرنے لگی خود ہی مری چاہت کا　　اپنی مخمور جوانی کی قسم کھاتی ہوئی

اپنی گزری ہوئی باتوں پہ خجل سی ہوتی پیاری آنکھوں سے گہر اشک کے برساتی ہوئی

شب گریزاں تھی ستاروں کو لئے دامن میں دوشِ ہستی پہ سیہ زلفوں کو بکھراتی ہوئی

میری حیرت مجھے دیوانہ کئے دیتی تھی
یہ حقیقت مجھے افسانہ کئے دیتی تھی

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)

حالی کی شاعری

قدرت سے بھی بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔ کون اس سے واقف نہیں کہ پانی پت کا مشہور میدان ملکی اور قومی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ہندوستان کی سیاسی قسمت کا فیصلہ تین مرتبہ اسی جگہ ہوا مگر قدرت کا حسنِ مذاق دیکھئے کہ " اردو ادب کا باغی " جدید شاعری کی داغ بیل ڈالنے والا بھی اسی مردم خیز خطہ میں پیدا ہوا۔ پانی پت کے محلہ انصار کو اس بات کا ہمیشہ فخر رہے گا کہ وہاں کے ایک معمولی مگر شریف گھرانے میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے ۱۸۳۷ء میں جنم لیا تھا۔

حالیؔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں آپکی پرورش ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی۔ ابتداءً قرآن شریف حفظ کرایا گیا۔ سید جعفر علی صاحب جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے تھے اور جو فارسی ادب، طب اور تاریخ میں یدطولیٰ رکھتے تھے اُن سے فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور انہیں دنوں میں حاجی ابراہیم صاحب سے صرف و نحو بھی پڑھی اس وقت آپ کی عمر سترہ برس کی تھی کہ سرپرستوں کے ایماء سے آپ کی شادی ہوگئی چنانچہ آپ لکھتے ہیں " اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا " یوں بھی حالیؔ کی تعلیم کچھ باقاعدہ نہیں ہوئی تھی اس پر شادی اور بھی دشواریوں کا باعث ہوئی۔ ایسی حالت میں تعلیم حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا لیکن حالیؔ کو تعلیم کا شوق حد سے زیادہ تھا اور یہی شوق گھر والوں سے چھپ کر حالیؔ کے دہلی چلے جانے کا باعث ہوا۔ قریب

ڈیڑھ برس دِلّی میں رہکر انھوں نے کچھ صرف ونحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں مولوی نوازش علی صاحب سے پڑھیں۔ ابھی تعلیم کے ابتدائی منازل ہی طے ہورہے تھے کہ عزیزوں کے جبر سے گھر لوٹنا پڑا لیکن مطالعہ کا چسکا لگ چکا تھا اس لئے محل و مقام کے قیود انہیں اس سے باز نہ رکھ سکے۔ انھوں نے گھر پر بھی اس شوق کو جاری رکھا۔

جس زمانے میں حاؔلی دِلّی میں مقیم تھے انھیں ایک دنیا نئی نظر آئی جس میں ایک طرف غاؔلب مومؔن، ذوؔق، نیّؔر اور شیفتؔہ کے سبب سے شعر و سخن کی مجلسیں ہمیشہ گرم رہتی تھیں اور دوسری طرف مفتی صدرالدین اور اُن کے ساتھی علوم و فنون کا دائرہ وسیع کرنے میں منہمک تھے (نیز خود اردو زبان بھی اس وقت تک متفرق آبیاروں کے باعث اس قابل بن گئی تھی کہ اس میں ادب وانشا کے علاوہ علوم و فنون کی متفرق کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور جن کی رفتار سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جارہی تھی۔ ایسے ماحول میں رہنے کے بعد ناممکن تھا کہ حاؔلی اس سے متاثر نہ ہوتے۔ چنانچہ ان ہی دنوں حاؔلی مرزا غاؔلب سے اکثر فیض صحبت حاصل کیا کرتے تھے اور ان صحبتوں میں خود مرزا غاؔلب سے اُن کے دقیق کلام کے مطالب دریافت کرلیا کرتے تھے۔ اسی اثنار میں حاؔلی نے اشعار کہنا شروع کیا اور ایک آدھ غزل لکھکر غاؔلب کو دکھلائی تو غاؔلب جو اپنے ہم جلیسوں کو شعر گوئی سے منع کرتے تھے آپ سے کہنے لگے "اگرچہ میں[1] کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"۔ مگر دِلّی میں دو ایک غزلوں سے زیادہ لکھنے کا اتفاق نہوا تھا کہ دِلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن "جب[2] تک حاؔلی دہلی میں مقیم رہے اکثر مرزا غاؔلب کی صحبت میں رہا کرتے تھے اور اُن ہی کے سامنے زانوئے شاگردی بھی تہ کئے تھے۔ اس اثنار میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور نکاتِ شعر مرزا غاؔلب سے ہی حل کراتے تھے۔ مرزا بھی ان سے بہت خوش تھے اور ان کی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے۔ دِلّی چھوڑنے کے بعد (بہ سلسلہ ملازمت)

---

[1] ترجمۂ حاؔلی۔ مقالاتِ حاؔلی حصّۂ اول۔　[2] تاریخ ادبِ اردو۔ از رام بابو سکسینہ۔

وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی۔"
اگرچہ حالی کبھی کبھی اپنے کلام کی اصلاح مرزا غالب سے لیتے رہے لیکن ان کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا رنگ غالب سے زیادہ شیفتہ سے متاثر تھا چنانچہ خود انہیں کے شعر سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہے — غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

علاوہ ازیں خود حالی کا کہنا ہے "درحقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم (شیفتہ) کی صحبت سے ہوا۔"[۱]

حالی ابتداً ایک غزل گو شاعر تھے اور ان کے ابتدائی کلام میں بھی عشق و عاشقی کے قصوں، لیلیٰ مجنوں کی حکایتوں، گل و بلبل کی داستانوں، گلے شکووں، جام و مئے کے تذکروں، فرضی تخیلات اور مبالغہ اور تصوری محبت کے سوائے اور کوئی دوسری چیز نہیں پائی جاتی لیکن سادگی جو اُن کی طبیعت کا جوہر تھا اس میں بھی پایا جاتا ہے اور اسی سادگی پسند طبیعت کے باعث غالب کے رنگ میں شعر کہنا حالی کیلئے دشوار تھا چند اشعار دیکھ لینے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا کلام آپ کے جذبات کا آئینہ ہے چنانچہ اس طرز کے کچھ اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھیرتی آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ — گھر ابھی دور ہے رسوائی کا
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا — ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب
عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شب تنہائی کا

---

[۱] ترجمۂ حالی۔ مقالاتِ حالی حصۂ اوّل

تھا آفتِ جاں اس کا اندازِ کمانداری | ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

درمیاں پائے نظر ہے جب تک | ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن | باتیں ہم سے کرو صفائی کی

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش | وہ علم و دین کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا | کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں | اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس

مجھ کو تم سے پر اعتماد دفا | تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا | بہت وسعت ہے میری داستاں میں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حالی مجبوریات کے تحت دلی چھوڑ کر راہیٔ وطن ہوئے اور یہاں کچھ دن رہنے کے بعد انہیں ملازمت مل گئی تھی لیکن یہ سہارا ملے ابھی زیادہ دن بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش بپا ہوئی اور ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ اس شورش و ہنگامہ مرج حادثات و واقعات رونما ہوئے تھے ان کا حال خود حالی کی زبان سے سنئے۔ کہتے ہیں "تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل بھی رخصت ہو چکے تھے حسنِ اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں ؎[1]

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود | بادِ در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ | حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

اگرچہ جس زمانہ میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا

[1] دیباچہ یادگار غالب

مجھے ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی ؎

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد　　شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خان غالب جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارہویں یا تیرہویں ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔"

اس فساد و شورش کے دردناک و روح فرسا حالات کا حالی کے دردمند دل پر بہت ہی گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ اس ہنگامہ کے بعد دہلی میں جو پہلا مشاعرہ منعقد ہوا اس میں مولانا نے شرکت کی اور اپنی درد بھری قلبی کیفیت کو غزل کی صورت میں سب پر نمایاں کیا اور سب کو اپنا شاملِ حال بنا لیا تھا۔ اب بھی کوئی ایسا شخص مشکل سے ملے گا جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتے ہوئے اس شورش کے حالات کو حالی کی زبانی سن کر متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہو۔ مطلع میں حالی نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ عشق و عاشقی، دل لگی و محبت سب چین و آرام کے کرشمے ہیں جب چین و آرام نہیں تو ان کی طرف مائل ہونا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے ؎

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ آنا ہرگز　　دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

اُس وقت دلّی سے نہ صرف قابل قدر لوگ ہی اُٹھ گئے تھے بلکہ قدر شناس بھی کوئی نہ تھا جو شخص اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانا چاہتا لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ جو رہنمائی کرتا اور راستہ بھولے ہوئے کو اس کا صحیح راستہ بتلاتا تھا اُسے خاطر میں نہ لایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہی حال مولانا کیا تھا بھی درپیش تھا اسی لئے خود کو مخاطب کرکے یوں کہتے ہیں ؎

کوچ سب کر گئے دلّی سے تیرے قدر شناس　　قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

یہ ایک حقیقت ہے کہ دلّی کی اگلی عظمت اور شان و شوکت کا ذکر ہر دردمند دل کو خون کے آنسو رُلاتا ہے اسی لئے مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد دلی سے علم و ہنر رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی گذشتہ شان رہ رہ کر یاد آتی ہے اسی جذبہ کے تحت شاعر علم و ہنر کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

اس افتاد کے بعد نہ اگلی محفلیں باقی رہیں اور نہ اگلے لوگ۔ ایسی صورت میں شاعری کا مزہ کرکرا ہو جانا ضروری ہے اسی لئے کہتے ہیں ؎

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہ و ذوقؔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

پھر آگے چل کر کہتے ہیں ؎

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

جب حالیؔ مقطع پڑھنے لگے تو خود ان کی حالت بری تھی و نیز اس بھری محفل میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو آنسو نہ بہایا اور جس کی ہچکی نہ بندھ گئی ہو ؎

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حالی ابتدائً صرف ایک غزل گو شاعر تھے لیکن جس وقت اور واقعات نے پلٹا کھایا تو حالیؔ کے خیالات بھی بدل گئے۔ اس بدلے ہوئے رجحان کے تحت انھوں نے ایک نیا راستہ دریافت کرلیا۔ اس نئی شاہراہ پر گامزن ہونے کے بعد اپنی اگلی شاعری پر غور کرنے سے انہیں معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک فریب تخیل تھا اور اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں "[۱] ـــــ البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں وحشت و جنوں کی

---

[۱] دیباچہ مسدس حالی

وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالہ و نیم باشی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا ـــــــ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ٹھوکر سے جی اُٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گذر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر اُتر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے ـــــــ ایمان سے بیزار رہے۔ پیر مغان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ برہمنوں کے چیلے بنے۔ بُت پوجے۔ زنار باندھا۔ قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں واعظوں کا مضحکہ اُڑایا دیر و بتخانہ کی تعظیم کی اور کعبہ و مسجد کی توہین کی ـــ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں ـــــ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں کوئی سفیدی باقی نہ چھوڑی" اب انہیں ایک ہی طرز کی شاعری مہمل نظر آنے لگی اور اس جمود شاعری میں ایک نئی روح پھونکنے کا خیال پیدا ہوا اور اسی مقام پر آکر اپنی پرانی روش کے متعلق کہتے ہیں "بیسویں[1] برس کی عمر سے چالیس سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔"

حالی کا جدید کلام ابتدائی کلام سے بالکل جدا ہے۔ اس میں واقعیت اور اصلیت کو جگہ دی گئی ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ محمد حسین آزاد کی تحریک کا اثر ہے لیکن اسی پر اکتفا کرنا مناسب نہیں اس لئے ہم خود حالی کی ایک تحریر ان کے دیوان کے دیباچہ سے نقل کرتے ہیں جس سے شاعری کے تغیر کا فریب سبب معلوم ہوتا ہے و نیز اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ اس طرز شاعری میں ابتداءً انہیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لکھتے ہیں "جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ سے لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ پراگندہ خیالات اور دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں ـــــ

---

[1] دیباچہ مسدس حالی۔

تب قافلہ کا ساتھ، راستہ کی ہمواری اور راہگذر کی فضا چھوڑ کر ایک دوسرا نیا راستہ اختیار کیا"۔ اور ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں " نگاہ[1] اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بیشمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں ——— جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا"۔ غرض یہ کہ ابتداءً قسم قسم کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ تکالیف کا سامنا کرنا خوف و ہراس اور ناامیدیاں اس سے دوچار ہونا پڑا لیکن اولوالعزمی برابر انکا ساتھ دیئے جارہی تھی حتیٰ کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچکر رہے اور اس مقام پر پہنچکر کہتے ہیں " زمانہ[2] کا نیا رنگ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی"۔ اور پھر اسی مقام پر سے زمانہ کی شکایت کرتے ہیں کہ ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ جدید شاعری کی طرف مائل ہونے کی باعث محمد حسین آزاد کی تحریک تھی اس کا خود حالی یوں اعتراف کرتے ہیں " لاہور[3] میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعۂ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں"۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں میں سے کچھ اشعار پیش کرنے سے قبل ہم مثنویوں کے متعلق کچھ لکھیں۔ انکی زبان سہل، بے تکلف اور طرزِ ادا نہایت ہی نیچرل ہے جس میں دور از کار تشبیہیں، استعارے اور فضول مبالغے مطلق نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس صنف پر مولانا کو آخر عمر میں بہت ہی کمال حاصل ہو گیا تھا

---

[1] دیباچہ مسدس حالی ۔ [2] ۔ ترجمۂ حالی ۔ [3] مقالات حالی حصہ اوّل ۔

لیکن قدیم شعراء کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظمیں زبان اور تخیل کے لحاظ سے کوئی درجۂ کمال نہیں رکھتیں اس کے ساتھ ہی کوئی اس بات سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کے رہبر ہیں جس میں معمولی مضامینِ شاعری کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کرسکتا ہے۔

برسات کی اہمیت کو کون نہیں جانتا۔ بارش نہ ہو تو فصل خراب ہوجائے سرسبز و شاداب اور تناور درخت سوکھ جائیں اور سارے جاندار بھوک وپیاس سے بیتاب ہوکر جان دیدیں۔ اسی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے مولانا حالی برسات کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

وہ شاخ و درخت کی جوانی وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات وہ کون خدا کی شان برسات

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ موسم سب کو بھاتا ہے اس لئے کہ اس میں نہ شدت کی دھوپ رہتی ہے اور نہ کڑاکے کی سردی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دل کو لبھاتی ہیں۔ اس کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

گھنگور گھٹائیں چھارہی ہیں جنت کی ہوائیں آرہی ہیں

پھر برسات کی ہی تعریف میں کہتے ہیں ؎

قدرت کے عجائبات کی کاں عارف کے لئے کتابِ عرفاں

ان اشعار کی سلاست اور فطرت نگاری کے متعلق کچھ کہنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ یہی حال پوری مثنوی کا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مثنویاں بھی ان ہی خوبیوں کی آئینہ دار ہیں لیکن یہ مثنویاں حالی کے کلام میں محاسن شاعری سے زیادہ اس لئے اہم ہیں کہ ان ہی سے اردو شاعری کی وسعت کے امکانات پیشِ نظر آگئے اور اس کے دامن سے فرسودگی کا بدنما داغ مٹ گیا۔

جب پنجاب گورنمنٹ بکڈپو سے حالی کا تعلق منقطع ہوا تو وہ ملازمت کے سلسلے میں دوبارہ مراجعت فرمائے دہلی ہوئے وہاں انہیں سرسید احمد خان جیسا ساتھی ملا اور زمانہ کے واقعات اور ساتھی کے وقتیہ ترغیبوں نے آنکھیں کھولیں اور معلوم ہوا کہ "قوم[1] کی حالت تباہ ہے

---

[1] دیباچہ مسدس۔

عزیز ذلیل ہو گئے ہیں شریف خاک میں مل گئے ہیں علم کا خاتمہ ہو چکا ہے دین کا صرف نام باقی ہے افلاس کی گھر گھر پکار ہے پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جا رہے ہیں تعصب کی گھنگور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پرواہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں"۔ ان واقعات کو دیکھ کر حالی کے دل میں ایک کسک ہوئی اور انہیں خیال پیدا ہوا کہ قوم کی اس ویران کھیتی کی آبیاری کی جائے۔ اسی خیال کی بنا پر "زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے بعض خیالات حسبِ ضرورتِ وقت اقوالِ سلف یا حکایاتِ سلف سے اخذ کئے گئے کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا ——— اور کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی جس کی چوٹ سب کے دلوں پر لگی"[1]۔ انہیں نظموں میں سے ایک مسدسِ حالی یا مسدسِ مد و جزرِ اسلام ہے جو سرسید کے اصرار پر لکھی گئی۔ اس نظم میں اسلام کے مد و جزر کا خاکہ نہایت عمدہ پیرایہ میں کھینچا گیا ہے۔ یہ نظم مسلمانوں کو ان کی پستی سے آگاہ کرتی ہے اور انہیں ان کے آباو اجداد کے کارناموں کو یاد دلا کر عبرت دلاتی ہے۔ اس مسدس کے خصوصیات میں انسانی دردمندی اور دلسوزی، جذبات کی سنجیدگی، دھیما دھیما ہوا لب و لہجہ اور زبان کی سادگی و بیساختگی داخل ہیں۔ یہ اپنے موضوع اور نوعیت کے لحاظ سے اردو میں سب سے زیادہ طویل نظم ہے اس کے باوجود ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی گئی اور بار بار مطالعہ کی گئی ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والوں کو تھکا دیتی ہیں لیکن مسدس اس عیب سے پاک ہے۔ شروع سے آخر تک پڑھ جایئے نہ کہیں گرانی محسوس ہوگی نہ جی اکتا جائیگا اس کا سب سے بڑا سبب نظم کا تسلسل اور

---

[1] دیباچہ دیوانِ حالی۔

زبان کی سنجیدہ سادگی ہے جو اس کی تاثیر کو اول سے آخر تک ایک حال پر قائم رکھی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ بند یہاں درج کرتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور سادگی سے حظ اٹھائیے۔

حالی کا قوم کے نام جو پیغام ہے اس کا ایک اہم جز یہ بھی ہے کہ ہمیشہ لکیر کے فقیر بنے نہ رہنا چاہیے۔ زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا اس لئے انسان کو چاہئیے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دے اسی چیز کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آشتی میں مری یاں گذارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑیگا کنارا

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

اگلے مسلمانوں کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

رہِ حق میں تھی دوڑ بھاگ ان کی — فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی — شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی

پھر موجودہ مسلمانوں کی پستی کا یوں ماتم کرتے ہیں ؎

نہ صحبت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ — نہ حق اسلام کا جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآن کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ — نہ حق کی حقیقت دکھا سکتے ہیں وہ

دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی

ایک جگہ مولانا حالی گذشتہ لوگوں کا ذکر جو علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے اس طرح کرتے ہیں ؎

ہر ایک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ — ہر ایک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل یکتا ہوئے وہ — سیاحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر ایک ملک میں پھیلی ان کی امارت — ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

پھر ہماری موجودہ پستی و محتاجی کا یوں نوحہ کرتے ہیں ؎

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں — تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں — تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شئے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ

آخر میں دست بدعا ہیں ؎

انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے — ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے

اس زمانہ کے رجحان کے مطابق اس نظم کے غیر دلچسپ تصور کئے جانے کے امکانات پر نظر رکھتے ہوئے خود مولانا حالی فرماتے ہیں "ہمارے[۱] ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں کا ترجمہ یا جو آجکل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگیں بیانی۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہلِ وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں۔ کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ . . . . گویا اہل دہلی ولکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت و شرم دلانے کے لئے کی گئی ہے۔"

حالی نے اس کو جس طرح روکھی پھیکی کھچڑی سے تشبیہ دی ہے حقیقت میں وہ ایسی نہیں بلکہ اس میں نمک مرچ اور دوسرے مسالے بڑی خوبی سے ملائے گئے ہیں۔ اب کھانے والے پر منحصر ہے اگر وہ اس کو مزہ لیکر نہ کھائے تو البتہ محض اُبالی معلوم ہوگی۔

---

[۱] دیباچہ مسدس۔

اس نظم کے مخالفین بہت سے پیدا ہوئے لیکن ان کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے چاند پر خاک اُڑانا۔ اس لئے ہم اس سے درگذر کرکے سر سید احمد خان کا وہ خیال پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اس نظم کے متعلق ظاہر کیا۔ وہ کہتے ہیں "اگر روزِ حشر خدا مجھ سے پوچھے کہ تو اپنی بخشش کے لئے کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا"۔ غرض اس مسدس میں فرضی تصورات اور مبالغہ کی جگہ حکمت اور فلسفہ اور پند و نصیحت کو دی گئی ہے۔

حالی کے کلام میں قوم کے مزاج و کردار، تہذیب و تمدن اور مذہب و معاشرت کا خاص عنصر پایا جاتا ہے اور حالی اپنی شاعری کے ذریعہ بغض، حسد، تعصب، بد اخلاقی خوشامد اور دروغ گوئی دقیقہ پرازی جیسے امور کا راز فاش کرتے ہیں اور وہیں ہاتھ رکھتے ہیں جہاں یہ عیوب پائے جاتے ہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زندگی پر تنقید کا ایک نہایت عمدہ اور موثر طریقہ طعن و طنز ہے جس میں کچھ ظرافت کا پہلو بھی شامل ہو۔ اس میں حالی کو بڑا کمال حاصل ہے۔ اس کی مثال میں ہم یہ قطعہ پیش کرتے ہیں ؎

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو تختِ پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا

پھر آگے کہتے ہیں ؎

نزدیک ان کے گویا بزعمِ عقل و دانش ہے کنگڈم سے آسان میڈم کو بس میں لانا

حالی کے کلام میں بازاری مضامین نہیں اور تہذیب سے گرے ہوئے خیالات تو سرے سے مفقود ہیں ان کی جگہ حکیمانہ اور عالمانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ حالی اپنے کلام میں ہر بات کو متانت اور سنجیدگی سے ادا کرتے ہیں۔ زبان بہت ہی سہل اور آسان ہے۔ کلام میں تشبیہات اور استعارے بہت کم ملتے ہیں اور اشعار کی بندش بظاہر سادہ لیکن معنوی طور پر گہرے مطالب کی حامی ہوتی ہے۔ غرض کہ ؎

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی دو چار ہیچ

احمد محی الدین متعلم سالِ دوم

انقلاب

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
نہ تابناکی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے کل جہان متعفن، ہوائیں سب مسموم
حیات بخش ترانے اسیر کب سے ہیں
قفس میں بند ترے ہم صفیر کب سے ہیں
رخ حیات پہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار

ترے لیے یہ زمین بے قرار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
ہے ذرہ ذرہ، پریشان کلی کلی مغموم
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر کب سے ہیں
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
نگارِ دہر میں اندازِ دلبری ہی نہیں
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
سروں میں دیر کا سودائے خام ہے اب تک
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم محی الدین ام۔اے۔ (عثمانیہ)

زندگی

خالو جان، حقہ پیتے پیتے تھک گئے تو پان کھانے اندر چلے آئے۔ خالہ جان چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں، میں بازو کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میری نظریں دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر کی تصویر پر جمی تھیں۔ ایک لڑکی "بڑی بڑی آنکھوں والی" کتابوں کا بستہ بغل میں دابے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتی کھڑی تھی ... دالان میں سے گھڑیال کی "ٹک ٹک" خالہ جان کے سروتہ کی "کٹ کٹ" کے ساتھ سر ملا رہی تھی۔ مجھے ان آوازوں کو سننے اور سوچنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ میں سوچنے لگا۔ وقت کی پابندی اور تحصیل علم کا خیال اب لڑکیوں میں بھی پیدا ہو چلا ہے۔ مردوں کی لاج اب خدا ہی کے ہاتھ ہے۔ اس لڑکی کے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگتا تو شگفتگی اور بشاشت کے رنگ میں بلند ہمتی کی بجلیاں سی کوندتی دکھائی دیتیں اور اس کی مسکراہٹ تو گویا کہہ رہی تھی کہ زندگی کے ہر مرحلہ میں کامیاب اور فتحمند رہونگی۔ اسی طرح مسکراتی رہونگی اور جو چاہونگی کرونگی کسی رکاوٹ کو، کسی طاقت کو خاطر میں نہ لاونگی۔ علم کے میدان میں قدم رکھا ہے تو دیکھ لینا۔ مردوں کے بھی کان کترونگی۔ مرد تو خواہ مخواہ آسمان پر جا بیٹھے ہیں۔ ہم کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ انہیں نیچا دکھانا پڑے گا۔ اور میں دکھاونگی۔

بس! بس رہنے بھی دیجئے اپنی تعلیاں۔ میں اس تصویر سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں۔ جائیے۔ جائیے۔ کالج کا وقت ہو رہا ہے۔ اور دھیمے لہجہ میں کہہ ڈالتا ہوں۔ ہم سے مقابلہ پڑے تو ساری شیخی کرکری ہو جائیے۔ میں فوراً سوچنے لگا کہ واقعی اگر قسمت سے ایسی ہی کسی لڑکی سے سابقہ

پڑجائے تو؟ میں کیا کروں گا؟ میں کیا کرسکتا ہوں؟ ... الگزنڈر ڈوما کا قول یاد آتا ہے عورتیں اپنی کمزوری کے بھرے پرشہ زوری دکھاتی ہیں۔ اور میں مطمئن ہوجاتا ہوں۔ خالو جان پان کے لئے باتیں بنانے لگتے ہیں۔ " جی۔ مگر آپ کے ہاتھ کے پان کی بات کہاں آتی ہے؟ صرف ایک پان عنایت ہوجائے۔ پھر رات کے کھانے کے بعد ہی تکلیف دی جائے گی... خالہ جان خاموش رہتی ہیں... البتہ سروتہ کی کٹ کٹ تیز ہوجاتی ہے... اور غصہ سے دانت پیسنے کی آواز سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی ہے۔ خالو جان کہتے ہیں "ارے صاحب پان بنانا بھی کچھ مشکل ہے۔ پاندان کھسکا لیا۔ چونہ' کتھہ' لیپ' دیا اور لیجئے'... اوں ہوں... یہ ترکیب بھی کارگر نہیں ہوتی" خالو جان مایوس ہوکر پاندان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔" لائیے میں ہی بنالیتا ہوں... خالہ جان کی آواز سنائی دیتی ہے۔" بھئی یہ حقہ بھی پان بھی کل سے افیون بھی شروع کردو شوق بھی ہیں تو کس ڈھنگ کے۔ باز آئی میں ایسے ... ... خالہ جان اتنا کہہ کر چپ ہوجاتی ہیں ...خالو جان سمجھ جاتے ہیں کہ باز آئی میں ایسے کے آگے۔" مردود سے" محذوف ہے.. ذرا تیز لہجہ میں پوچھتے ہیں۔

" اور وہ آپ کا بھانجہ جو پیتا ہے ...کس مزے سے گڑ گڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ تو شاید اچھا کرتا ہے۔" " وہ تو سب آپ کی کرامت ہے... وہ پینے سے انکار کرتا ہے تو کہتے ہو کہ دو دم سے کیا ہوتا ہے... حقہ پھیپھڑوں کے لئے مفید ہے' اور کیا کیا اجی آپ تو مجھے بھی پینے کو کہتے ہیں.. بہرحال ..." خالہ جان چھالیہ کترنا بند کردیتی ہیں.. اور پاندان کھول کر کچھ ڈھونڈتی رہتی ہیں.. خالو جان پان سے ہاتھ دھوکر.. وہاں سے اٹھنے ہی کو ہوتے ہیں کہ" ذرا ٹھیریئے پان لیتے جایئے"

خالو جان پان چباتے۔ مسکراتے.. میرے کمرے میں آتے ہیں..

" کہئے جناب آپ بھی پان کھائیں گے" میں مسکرانے لگتا ہوں..." دیکھئے" خالو جان لہجہ کو سنجیدہ کرکے کہتے ہیں۔" ہندستانی بیوی سے یہی مصیبت ہوتی ہے آج کوئی میم ہوتی تو پاندان اور حقہ لئے بس پیچھے پیچھے پھرتی رہتی.."

"جی ہاں پھرتی رہتی۔ آج چندیا پہ ایک بال بھی دکھائی نہ دیتا۔ میں کہتی ہوں اب بھی کچھ نہیں گیا۔ لالو "، خالو جان نے بیچ سنجیدہ لہجہ میں پوچھا " دیکھئے آپ خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہیں۔ پھر جھگڑنے نکلیں گے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ سن رہی ہیں آپ۔" اور خالو جان میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔" میاں وہ تمھارے ماسٹر کی سالی ہے نا۔ ہم کو پسند ہے۔ چلو یوں تو یوں ہی سہی۔" خالہ جان اُٹھ کر دروازہ کے قریب آگئیں تو خالو جان نے مسکراتے ہوئے کہا " ذرا اپنے بھانجہ کو بھی سنادیجئے کہ آپ میم سے راضی ہیں اور یہ کہ بعد میں آپ کو شکایت نہ ہوگی۔ کہدیجئے۔" خالہ جان نے کہا "واہ میں کہوں" خالو جان نے اشارہ سے مجھے دروازہ کے قریب بلایا اور خود اس طرف جھانکتے ہوئے کہنے لگے " نیک کام میں دیر کیا ہے۔ کہدیجئے نا" اور خالو جان نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ اور خالو جان کے شانوں کا سہارا لے کر دالان میں نظر دوڑاتا ہوں۔ تو ... خالہ جان مسکراتی کھڑی ہیں۔ اور اپنے داہنے ہاتھ کو اس طرح حرکت دے رہی ہیں جیسے پنکھا جھل رہی ہوں نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" جانے دیجئے نہیں لاتے میم کو " خالو جان کہتے ہیں، اور میں ہنستا ہوا پھر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہوں "

خالو جان کی گھریلو زندگی میرے لئے ایک دلکش اور پرلطف خواب ہے۔ اس ماحول میں مجھے زندگی پھولوں کی طرح مسکراتی نظر آتی ہے۔ اور مجھ جیسا شادی کا منکر بھی تھوڑی دیر کے لئے شادی کو زندگی کی سب سے بڑی آرزو بنا لیتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو شادی کے بعد زندگی اسی طرح ایک دوسرے کے خلوص، اعتماد، اور ایثار کی آغوش میں بسر ہو تو کیا کہنے ہیں۔ جگر کہتا ہے ع اس طرح بسر ہو تو بہت خوب بسر ہو۔ اب رہا رنجشوں کا سوال تو اُسے بھی ایک چھیڑ سمجھ لیجئے۔ اتنی سی بات ہوتی ہے۔ بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھتی ہے کہ ادھر خالو جان چپ تو ادھر خالہ جان۔ یا بہت ہوا تو کھانے سے انکار " نہیں بھوک نہیں ہے "، ان جھگڑوں کا حال تو یہ ہے کہ دن کو لڑائی۔ رات میں سمجھوتہ اور صبح میں بالکل صفائی۔ اور یہ صورت بھی مہینوں میں ایک آدھ دفعہ پیدا ہوتی ہے ورنہ وہی دن رات۔ وہی محبت اور مسرت۔ اور وہی زندگی کا

راستہ جیسے یہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے طے کرتے رہتے ہیں زندگی کا راستہ پُرخطر سہی۔ لیکن ان مسافروں کے لئے یہ کانٹا پھول، اور ہر مصیبت راحت بن جاتی ہے۔ وقت گزرتا جائیگا۔ اور ان کی زندگیاں، دامن سے دامن باندھے مسرت کے پھولوں میں تلتی رہیں گی
میں اپنے متعلق بھی سوچتا ہوں کہ آخر میرا کیا حشر ہونے والا ہے، میری آئندہ زندگی کو قسمت نے کس اسلوب پر ڈھالا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ رہ رہ کر وہی بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کی تصویر نظروں میں پھرنے لگتی ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ خالو جان پوچھتے ہیں"۔

"کچھ نہیں۔ طبیعت آج افسردہ سی ہے۔ وقت کسی طرح کٹتا نظر نہیں آتا۔"

"وقت گزارنے کی ایک بہت اچھی ترکیب بتاتے ہیں۔"

میں خالو جان کو تکتا رہجاتا ہوں۔ "تم چپکے سے اس دروازہ سے اپنی خالہ کے کمرے میں پہنچ جاؤ میں اس طرف سے آتا ہوں۔" میں نے کچھ پس وپیش کیا تو کہنے لگے "تم جاؤ تو سہی۔"

میں دبے پاؤں خالہ جان کے کمرہ میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خالو جان آگئے کمرہ کے اندر داخل ہوکر انہوں نے دروازہ بند کردیا اور زنجیر چڑھادی۔ "ہاں۔ اب تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اور اس کھڑکی کے پٹ کھولدو۔" یہ کہہ کر خالو جان نے الماری کھول کر اس میں سے کنجیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اور تھوڑی دیر الٹ پلٹ کر کے ان میں سے ایک کنجی نکال لی۔ میز کے خانہ کو اس کنجی سے کھولا گیا اور خالو جان اپنے ہاتھ میں "تصاویر کا البم" سنبھالے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھنے لگے۔
میں نے پوچھا۔ "یہ کیا" "تم دیکھو تو!" خالو جان میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ اور تھوڑی دیر سوچ کر البم پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ خاص جذبہ اپنی پرچھائیاں ڈال رہا تھا، جو گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے سے چمک اٹھتا ہے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر انہوں نے البم کھولا۔ "آہ"

میری نظروں کے سامنے خالو جان دھاری دار سوٹ پہنے کھڑے تھے۔ چہرہ سے

معصومی اور جوانی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں "یہ کون ہے پہچانتے ہو؟" میں نے جواب دیا شکل سے پہچانتا ہوں نام یاد آتا نہیں۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ "خالو جان" اتنے میں آسمان پر ابر خوب گھر کر آگیا۔ کھڑکی کے کھلے رہنے کے باوجود کمرہ میں اندھیرا چھا گیا۔ ہم تصویر دیکھنے میں ایسے محو تھے کہ کھڑکی کی طرف دیکھنے کا خیال بھی نہ آیا۔ خالو جان تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "سچ کہنا تمھیں اس تصویر میں کوئی خاص بات نظر آتی ہے؟" میں بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ "جی خاص بات تو یہی دکھائی دیتی ہے کہ آپ دکھائی دیتے ہیں" خالو جان مسکرانے لگے۔ جانتے ہو۔ یہی تصویر تھی جو ہم سے پہلے ہماری سسرال کو گئی۔ مگر میں پوری دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ "ناپسند ہوئی یہ تصویر۔ کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "بھئی اب کیا کہہ سکتے ہیں ہر ایک کی پسند ہے، ہر ایک کی نظر ہے۔ مگر خالو جان تصویر ناپسند ہوئی تو کیا آپ تو پسند آ گئے نا" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا اور خالہ جان کا کیا خیال ہے" "ارے انکا چھوڑو۔ وہ تو کہتی ہیں کہ تصویر ابھی یوں نظروں کے سامنے تھی۔ اور ابھی کہاں تو دل میں۔ بس نقش ہو گئی۔ بھئی یہ انکا کہنا ہے۔ مجھے جھوٹ کہنا تو آتا نہیں۔ مگر میاں ہم ہیں تو بھی خوش قسمت!! ایسی سلیقہ شعار محبت کرنے والی بیوی قسمت ہی سے تو ملتی ہے میں نے آہستہ سے کہا "مگر خالو جان، خالہ جان بھی خوش قسمت ہیں کہ آپ کے جیسا شوہر ملا۔ بس بس مجھے منہ دیکھی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں، خالو جان نے البم کا صفحہ الٹا۔ "دیکھو یہ ہیں ہم اور ہماری بیوی صاحبہ۔ یہ تصویر کچھ ٹھیک نہیں اتری۔ دیکھ رہے ہو نا۔ کمبخت فوٹوگرافر نے ہم کو تو بالکل افریقی بنا دیا ہے۔ اور ان کی تصویر تو جیسے نور کے پانی میں دھوئی گئی ہے۔ بابا یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ مرد چاہے کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ تصویر کھنچواؤ تو بس یونہی معمولی آئیگی، اور عورت کیسی بھی ہو۔ تصویر دیکھو تو چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ خالو جان نے تیسری تصویر دکھلائی۔ "یہ تصویر" خالو جان نے کہا۔ یہ تصویر دنیا کے حسین ترین مقام کی ہے۔ اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں۔ ندی ہے جنگل ہے۔ ایک خوبصورت بنگلہ ہے۔ میں نے پوچھا سوئٹزرلینڈ کا کوئی مقام ہے کیا؟" کہنے لگے۔ یہ میری جاگیر کا ایک مقام ہے۔ تمھیں بھی سمجھیں گے۔

مگر تم شادی کرلو پہلے وہاں ۔ اکیلے جانے کی اجازت نہیں ۔ خالو جان مسکرانے لگے ۔ میں نے گردن جھکالی اور تصویر کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا ۔ واقعی مقام تو پر فضا اور دلچسپ دکھائی دیتا ہے ۔" ہا " خالو جان کے منہ سے نکلا " شادی سے پہلے مجھے یہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن یقین مانو نام کو رونق نہ تھی ۔ دوبارہ جو گئے تو کچھ نہ پوچھو ۔ ندی سے راگوں کے آبشار اُبلنے لگے ۔ جنگلوں پر بہاریں چھاگئیں ۔ شادابی ۔ دلکشی ۔ امنگ ! چاروں طرف جھومتی گاتی نظر آتی دن بھر سوتے رہتے ۔ اور رات بھر جاگتے رہتے ۔ ایک رات کا واقعہ سناتا ہوں ۔ خالو جان ایک رات کا واقعہ سنائیں اور میں دلچسپی سے نہ سنوں ۔ خالو جان سوچتے لطف اٹھاتے اور مزے لے لے کر سنانے رہتے ۔ ایک رات بڑی سہانی تھی " چاندنی رات تھی ۔ آسماں پر چاند اپنے پورے نکھار پر تھا ۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی ۔ ہر جھونکا خوشبو کی پھوار سی برساتا منظر کی دلکشی روح پرور جادو کا سا سماں باندھ رہی تھی ۔ ساری دنیا کا سناٹا ہم دونوں کی باتوں کو سن رہا تھا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا ۔ جیسے ہر چیز ہمارے لئے اپنی دلکشیوں کے خزانے لٹا رہی ہے ! آسمان پر چاند تارے چمک رہے تھے ہمارے لئے ۔ ہوا چل رہی تھی تو ہمارے لئے ۔ درخت جھوم رہے تھے ۔ پرندے گا رہے تھے تو ہمارے لئے ... ساری فضا پر ہم ہی ہم چھائے ہوئے تھے ۔ اتنے میں تمہاری خالہ کی نظر سامنے کے ٹیلوں پر اُگنے والے درختوں پر پڑی ۔ کہنے لگیں ۔ ذرا دیکھئے تو وہ پھول " ایک بڑا سفید پھول ڈالی پر اس طرح چمک رہا تھا جیسے دھوپ میں کنول میں نے اپنی پھرتی دکھانی چاہی ۔ وہ کوئی پھول دکھائیں اور میں نہ توڑوں ۔ جھپٹ کر میں ٹیلے پر چڑھ گیا ۔ ایک بڑی سی چٹان ، بیضوی شکل کی زمین سے آٹھ نوفٹ بلند کھڑی تھی ۔ اس کی سطح پتے ہوئے لوہے کی طرح چمکدار تھی ۔ اور چاندنی میں وہ چاندی کی طرح چمک رہی تھی ۔ میں تیزی میں چٹان کے اوپر چڑھ گیا ، پھول کا درخت میرے سامنے تھا ۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نیچے کھڑی منتظر تھیں کہ اب پھول ڈالی سے ان کے ہاتھ میں آیا اور اب میں نے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کافی دور تھا ۔ میں نے قدم آگے بڑھایا ۔ اور خدا کی پناہ ! سنبھلنے سنبھلنے تک ایک

گڑھے میں گر پڑا۔ درخت کی شاخوں کو پکڑ کر بچنا چاہتا ہوں تو وہ بھی چرچر کرتی میرے ساتھ نیچے آر ہی ہے۔ کہنی اور پسلیوں پر کافی خراشیں آئی تھیں۔ سانس پھول رہی تھی۔ اور دہشت سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ چاندنی ہوتو کیا رات پھر رات ہوتی ہے۔ میں نے قدم تو بڑھا دیا لیکن یہ نہ دیکھا کہ چٹان میں شگاف ہے۔ اور اچھا خاصا کنواں منہ کھولے میرا منتظر ہے۔

اتنے میں تمھاری خالہ بھی اوپر آگئیں۔" میں یہاں ہوں" میں نے پکار کر کہا۔" تو پھر اوپر آیئے نا" انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اب میں جو اس گڑھے کو دیکھتا ہوں تو پتھروں سے گھرا ہوا۔ اور انکی سطح ایسی چکنی کہ چڑھائی قطعی ناممکن تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پھر کیڑوں کے شور سے رہی سہی ہمت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ ان آوازوں میں کوئی سانپ یا بچھو کی آواز ہو تو.. وہ مارے سردی کے میں کانپنے لگا۔" اب آپ اوپر آیئے۔ نہیں تو میں بھی گرتی ہوں" میں نے جواب دیا کوشش تو کر رہا ہوں۔ یہ دیکھئے۔" میں نے پتھر پر ہاتھ جمالئے اور اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن تھوڑی دور جا کر پھسل کر گر پڑا۔ تمھاری خالہ نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا۔ چلئے اب آجایئے اوپر "جی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس پر انھوں نے اپنی ساڑی کا پلو لٹکایا۔" میں نے کہا۔ اس سے کیا ہوتا ہے.. وہ یہی ہوگا۔ آپ بھی۔ اور میں بھی۔ دونوں اسی گڑھے میں صبح تک مقید رہیں گے۔" انھوں نے کہا۔ دیکھئے۔ میں اس درخت کی پیڑ کو مضبوط پکڑ لیتی ہوں۔ آپ کسی طرح اوپر آجایئے۔ چلئے تیار ہو جایئے۔ میں "ہوں" کہوں تو سمجھ لینا کہ میں نے درخت کو پکڑ لیا ہے۔"" مگر سنو تو۔ خواہ مخواہ تکلیف ہوگی" مگر وہ اپنی ساڑی کو میرے لئے رسی کی طرح لٹکا کر چلی گئیں۔ میں نے پلو تھام لیا۔ بہت قیمتی ساڑی تھی۔ انہیں بہت پسند تھی۔ اتنے میں آواز آئی "ہوں" میں نے جھٹکہ دے کر اندازہ کر لیا کہ میرا وزن تھام سکیگی یا نہیں۔" دیکھئے مضبوطی سے۔ دیکھئے۔ اور میں نے بسم اللہ کہہ کر جو پاؤں اُٹھایا تو ایک دو، تین اوپر پہنچ کر ہی دم لیا۔ یہ حال تھا جیسے دنوں کا بھوکا پیاسا ہوں۔ زبان خشک، حلق خشک۔ اُف بڑی تباہ حالت تھی اور انکی ساڑی کا ایک کونہ تو کانٹوں میں اُلجھ کر بالکل چھلنی ہو گیا تھا۔ اور خود ان کا حال یہ تھا کہ درخت

کی پیڑ سے لپٹی کھڑی ہیں۔ ساڑی انکی کمر اور درخت کی پیڑ کو اس طرح لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے انہیں باندھ دیا ہو۔ میں جو قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ آنکھیں بند ہیں میں نے ان کا شانہ جھنجوڑا تو آنکھیں کھلیں۔ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ اور آہستہ سے نیچے بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر آرام لے چکیں تو میں نے کہا: "ذرا ہاتھ تو دکھایئے ادھر" گھسنے کی وجہ سے کہنی تک زخم تھے۔ ہا۔ خون بہ رہا تھا۔ اور وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھا۔ اس پھول کے درخت کے پاس گیا۔ ایک دوسری ڈالی کی مدد سے اُسے جھکایا اور توڑنے سے پہلے۔ انکی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ مسکراتی بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں کی نظریں آسمان پر بہنے والے چاند کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے وہ پھول توڑ لیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نیچے گرنے کے بجائے بلند ہوتا جا رہا ہوں" چاند کی کرنیں مجھے اوپر اچھال رہی ہیں اور گاتی ہوئی ہوائیں مجھے پر لگا رہی ہیں اس وقت میرے پاس دو پھول تھے۔ "ارے بھئی یہ اندھیرا تو بڑھتا ہی چلا" خالو جان نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے" ان کے منہ سے نکلا۔ میں بھی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔" ارے آپ" کھڑکی سے لگی ہوئی خالہ جان کھڑی تھیں۔ دھوپ میں ان کے بال چمک رہے تھے۔ اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ "آپ اندھیرا کئے کب سے کھڑی ہیں"۔ خالو جان نے پوچھا لیکن خالہ جان اس وقت نجانے کہاں تھیں۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو بڑے بڑے قطرے ڈھلک کر ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔ خالو جان دم بخود کبھی خالہ جان کو اور کبھی اس تصویر کو دیکھتے۔ میں آہستہ سے اُٹھا۔ اور دبے پاؤں دروازہ کا رخ کیا۔ جانے سے پہلے خالو جان کی طرف دیکھتا ہوں تو انکی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ خالہ جان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بغل میں البم دابے، اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور لیٹنے سے پہلے دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس لڑکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ۔ اور وہ بڑی بڑی آنکھیں مجھے ایک ایسی دنیا میں چلنے کی دعوت دے رہے تھے۔ جہاں: اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں ندی ہے جنگل ہے اور ایک خوبصورت بنگلہ ہے۔

رشید قریشی متعلم ام۔اے (آخری)

کسی کو دیکھ کر

چاند سے چہرے پہ اک بے تاب کن دلکش امنگ
جیسے ڈھلتی شام میں نکھرا ہوا کلیوں کا رنگ

حسنِ دلکش کو ترے تکمیلِ رعنائی کہوں
یا عروسِ صبح کی مخمور انگڑائی کہوں

کتنا دلآویز ہے تیرا ہر اندازِ بیاں
حل ہوئی ہیں جس میں گویا سیکڑوں مستیاں

عارضِ رنگیں پہ رقصاں ہے ادائے دلکشی
جیسے کلیوں کا تبسم جیسے پھولوں کی ہنسی

شعلۂ جوالہ ہے یا جلوۂ خورشید ہے
ہر تبسم داستانِ شوق کی تمہید ہے

زندگی کیا ہے۔ تری آنکھوں کا اک پیغام ہے
اور جنت تجھ سے ہم آغوشیوں کا نام ہے

ہائے وہ آنکھیں جھکا کر مسکرانے کی ادا
میرے دل کی دھڑکنیں دینے لگیں تجھ کو دعا

مست آنکھیں بھی ہیں اور بہکے ہوئے انداز بھی
جن میں رقصاں ہیں مری مدہوشیوں کے راز بھی

شوخ ۔ بے پروا ۔ حسیں ۔ ناآشنا ۔ بیدادگر
سیم تن ۔ نازک بدن ۔ گل پیرہن ۔ جادو نظر

ہائے وہ بوٹا سا قد ۔ وہ حسن ۔ وہ طرزِ خرام
ڈر رہا ہوں میں کہ برہم ہو نہ دنیا کا نظام

چھڑ گیا تیرے نظارے سے ربابِ زندگی
کروٹیں لینے لگا دل میں شبابِ زندگی

میری جانب بھی نگاہِ لطف وہ مستِ شباب
ذرۂ ناچیز ہوں مجھ کو بنا دے آفتاب

قادر محی الدین احمد اسیر متعلم بی اے (آخری)

عالم مثال

حکما کے دو گروہ ہیں وحدیہ، ثنویہ۔ وحدیہ تو وہ ہیں جو صرف ایک ہی عالم کے قائل ہیں
ان کے نزدیک مبدء، عالم بھی ایک ہی ہے۔ وحدیہ کے دو گروہ ہیں ایک مادیین یا طبیعین دوسرے
روحانیین۔ مادیین وہ ہیں جو صرف مادہ کو تسلیم کرتے ہیں سوائے مادہ کے کسی چیز کے قائل ہی نہیں
چنانچہ عقل حیات اور قوائے مدرکہ ذہنیہ کو بھی مادہ ہی تصور کرتے ہیں۔ ان کے پاس مبدءِ عالم
ایک ہے۔ وحدیہ کا دوسرا گروہ جو روحانیین ہے طبیعین سے بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے۔
چنانچہ وہ مادہ کے وجود کا سرے سے بطلان کرتا ہے۔ صرف نفس اور روح کا قائل ہے
یعنی عالم اور اس کی جمیع موجودات جو کچھ بھی ہیں تو وہ نفس اور روح کے مظاہر ہیں۔ اس گروہ
کے نزدیک عالم حسّی کا درجہ وہم و تصوّر سے بڑھ کر نہیں اور انسان محض روح ~~اور جسم کا مجموعہ~~
ہے روح کا علم اور اس کے رموز و حقائق علم ظاہر کے طریقہ استدلال سے منکشف نہیں ہو سکتے بلکہ
اس کے لئے تو اور ہی اسباب (بصیرت) ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جسم ظاہر سے صرف ظاہری
اشیا محسوس ہوں گے اور باطنی حواس عالم رویا میں (جس کو حکماء اشراق نے عالم مثال سے
تعبیر کیا ہے) ایسے ہی سرگرم عمل رہتے ہیں جیسے ظاہری حواس عالم شہود میں ؎

بو نہیں رنگ نہیں نور نہیں نار نہیں
معرفت کیوں نہ ہو دشوار الٰہی تیری
حالی

حکما کا دوسرا گروہ جو ثنویہ ہے دو مبدء، عالم کا قائل ہے مادہ اور روح۔

بنابریں وہ عالم حسی یا شہودی کو مادہ اور روح کا جلوہ گاہ بناتا ہے اور جمیع موجودات عالم کو انہیں کی نیرنگیوں اور کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

حکماء کی اس تقسیم کو ختم کرتے ہوئے اب ہم علماء اسلام کے ان نظریات سے جو عوالم سے متعلق ہیں بحث کریں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جن کے قلوب علم و حکمت کے ساتھ ساتھ نور معرفت سے بہرہ یاب ہیں، انہوں نے اپنے ذوق عرفان اور لطیفۂ غیب یا فیض وجدان سے ایک ایسا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو نظر و استدلال سے مختلف ہے۔ یہ تین عالم کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک تو عالم اجساد جس کو عالم شہادت یا نظر بھی کہتے ہیں اور کبھی مادیات کے نام سے بھی موسوم کر لیتے ہیں۔ دوسرا عالم، عالم ارواح یا عالم غیب ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مادیات سے منزہ اور ما فوق ہے اب رہا تیسرا عالم یہ عالم مثال ہے جس کو عالم برزخ بھی کہتے ہیں جہاں عالم اجساد اور عالم ارواح' عالم شہادت اور عالم غیب دونوں کے اوصاف مجتمع ہوتے ہیں۔ عالم اجساد کی چیزیں وہاں پیکر مادی سے منزہ ہو کر سامنے آتی ہیں اور غیر مادی معانی اور حقائق نیز عالم ارواح کی مخلوقات وہاں متجسم و متجسد ہو کر دکھائی دیتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ارباب معرفت کا عالم مثال اور افلاطون کا عالم مثل ایک ہی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ افلاطون کا مذہب اور ارباب بصیرت کا جدا ہے۔

افلاطون کا مذہب افلاطون ثنویین سے تھا کہ عالم دو ہیں۔ عالم مثال اور عالم مادہ حقیقی عالم جس میں ہر شئی کا اپنی پوری اصلیت کے ساتھ وجود ہے عالم مثال ہے۔ یہ وہی عالم ہے جسے ارباب حق روحانیت کہتے ہیں۔ یہ عالم ہماری نظروں سے اوجھل ہے اور حواس ظاہری سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ عالم مادی ہے۔ عالم مثالیات میں افراد شئے موجود نہیں رہتے بلکہ ہر شئے کی ایک صورت نوعیہ موجود رہتی ہے اور عالم مادی میں جو اشیاء ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب اسی صورت نوعیہ یا مثالیہ کے عکسوں یا تصاویر ہیں مثلاً انسان کی مجرد صورت نوعیہ جو تمام افراد انسانی سے مختلف ہے عالم مثال میں قائم ہے اور عالم مادی میں ہمیں جتنے انسان زید بکر

عمر و وغیرہ جو نظر آتے ہیں تو وہ سب مثل عکس یا تصویر کے ہیں۔ اسی انسان کے مثالیہ کے نقش یا نمونہ پر تیار ہوئے ہیں۔ ان کے اور اصل مثالیہ انسان کے مابین جو مطابقت ہے وہ اسی حد تک ہے جتنی کہ ایک جسم اور اس کے عکس یا تصویر کے درمیان ہوسکتی ہے۔

افلاطون کے عقیدہ کے روسے ہر شئے کی ایک صورت نوعیہ ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ عالم محسوس میں جتنے بھی اشیاء پائے جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی نوع کے تحت ہیں اور یہ انواع عالم مثال کے لئے بمنزلۂ اجزاء ہیں اور اس عالم مادی کی چیزیں اسی نوع کی ظلال ہیں جن کو جزئیات کہتے ہیں اور جن کا حقیقی وجود انواع یا مثل کو حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر صور نوعیہ قدرت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر افراد و جزئیات کی صورت اختیار کر کے عالم مادی میں ظاہر ہوتے ہیں مگر غور طلب یہ بات ہے کہ ان افراد و جزئیات کا کوئی مستقل وجود نہیں کیونکہ وہ اپنی نوع کے تابع اور اپنی نوع کے عکس ہیں۔ پھر ان میں سے تمام انواع کی ایک مستقل روح نوعی ہے جو ان جزی انواع پر حکمران ہے جس کا اصطلاحی نام "رب النوع" یعنے خدا ہے۔

انسان کی مجرد صورت نوعیہ جو تمام افراد انسانی سے الگ ہے عالم مثال میں قائم ہے اور عالم مادی میں جتنے مشخصات یعنی انسان (زید بکر عمرو) نظر آتے ہیں۔ وہ سب تصویر کے مثل ہیں جو اسی انسان کے مثالیہ کے نقشہ یا نمونہ پر تیار ہوئے ہیں نفس کلی اور مطلق نوع کا خارج میں وجود نہیں مثلاً ہم کہتے ہیں مور چنگھاڑتا ہے' انسان ہنستا ہے' تو یہ کسی خاص انسان کی نسبت حکم نہیں لگایا گیا بلکہ مور اور انسان کی نوع پر اطلاق کیا گیا لیکن کلی انسان' نوع طاؤس کا وجود تو اس عالم محسوس میں نہیں پایا جاتا تو اس کے یہی معنی ہوئے کہ کہیں بھی نہیں حالانکہ وجود کا کہیں نہ کہیں پایا جانا ضروری ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ کلی انسان اور نوع طاؤس کا وجود ہے تو پھر کہاں ہے!! عام جواب جو اس بارہ میں دیا گیا وہ یہ ہے کہ ذہن میں ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ ذہن جو ہمارے محدود و مختصر دماغ کا ایک دوسرا نام ہے کوئی ایسا ظرف تو ہے نہیں جس میں ساری کائنات سما سکے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ ایک اور عالم کا وجود ہوگا جو کلیات

اور انواع کا مسکن ہے اسی عالم کو افلاطون عالم مثال کہتا ہے یا عالم شہادت یا نظر کی ہر چیز کو اپنی اپنی نوع کے تحت ہونا ثابت کیا ہے۔

علماء اسلام میں امام غزالیؒ ہی وہ پہلے شخص گذرے ہیں جنھوں نے عالم مثال کی حقیقت بیان کی ہے۔ انھوں نے لفظ عالم مثال کو وجود کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ کسی شئے کے وجود کا ثبوت ہمارے پاس سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس کا تعقل و ادراک کریں کیونکہ ہمارے معلومات محسوسات اور اذہان میں موجود ہیں اور ان کا یہ وجود بھی ایسا ہی ناقابل انکار ہے جیسا عام اشیاء کا خارجی وجود۔ اس بنا پر امام موصوف کے نزدیک وجود کی تین قسمیں ہیں (۱) وجود حسّی۔ (۲) وجود عقلی۔ (۳) وجود خیالی۔

ان حکماء فلاسفہ کو چھوڑ کر اگر ہم نقل کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث میں عالم مثال کے متعلق سینکڑوں آیات و احادیث پائے جاتے ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی اور غیر عنصری ہے۔ جس میں معانی یعنی اعراض و حقائق ان اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہوتے ہیں پہلے اس عالم لطیف میں ان کا صدور ہولیتا ہے پھر وہ دنیا میں متحقق ہوتی ہیں اور ان کا یہ دنیوی وجود ایک اعتبار سے عالم مثال کے وجود کے عین مطابق ہوتا ہے اور جو معانی کے اندازہ کے بالکل موافق۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "ہمنے اپنی روح مریم کے پاس بھیجی تو وہ مریم کے سامنے ایک آدمی کی ہیئت میں نمودار ہو کر آئی" حدیث میں وارد ہے کہ "جب اللہ پاک نے رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑی ہوگئی اور گویا ہوئی کہ یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحم سے پناہ مانگتا ہے اور تیرے حضور میں پناہ کا طالب ہے" "سورہ بقرا اور آل عمران بروز حشر بادل یا سائبان یا صف بستہ پرندوں کی شکل میں آئیں گے اور اللہ پاک کی جناب میں ان لوگوں کی جانب سے حجت اور سفارش خواہ ہوں گے جنھوں نے اُن کی تلاوت اور ورد رکھا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ سورتوں کا سایہ فگن ہونا اور روح کا قطع رحم سے پناہ مانگنا

سب معانی ہیں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کہتے ہیں کہ جو شخص ان احادیث کو دیکھے گا تو لامحالہ حسب ذیل تین باتوں میں سے کسی ایک کو ضرور تسلیم کرے گا۔ (۱) یا تو حدیث کے ظاہری معنی مفہوم ہوں گے (اور اگر ظاہری معنی مفہوم ہوں تو لامحالہ عالم مثال کا قائل ہونا پڑے گا جس کا ذکر ہیں نے پچھلے اوراق میں کر دیا ہے۔ محدثین نے بھی اسی طریقہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسری بات جس کو شاہ صاحب بیان کرتے ہیں یہ ہے کہ شاہد حدیث اس بات کو تسلیم کرے گا کہ دیکھنے والے کے حاسہ میں واقعات کی یہی تشکیل ہوگی اور اس کی نظر میں واقعات اسی طرح متمثل ہوں گے گو ان کا وجود اس کے حاسہ کے باہر یعنی خارج میں نہ پایا جائے۔ قرآن پاک میں ہے کہ "آسمان اس دن صاف دھواں بنکر نمودار ہوگا اس آیت کے معنی حضرت عبداللہ ابن مسعود نے قریب قریب یہی لئے ہیں کہتے ہیں کہ لوگوں پر قحط پڑا تھا۔ جب لوگ آسمان کی طرف نظر کرتے تھے تو آسمان بہ سبب شدت گرسنگی صرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا اور ابن ماجشوں سے مروی ہے کہ جن احادیث میں خدا کے نزول اور مرئی ہونے کا ذکر ہے ان کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک اپنی مخلوقات کی نگاہوں میں ایک ایسا تغیر پیدا کردے گا کہ وہ خدا کو اترتے ہوئے دیکھیں گے اور کہ وہ اپنے بندوں سے ہمکلام بھی ہے۔ درانحالیکہ خدا کا نقل مقام کرنا محال ہے ورنہ نقل مقام اور تبدیل حیز کے یہی معنی ہوئے کہ اس کی عظمت و بزرگی میں تغیر پایا جاتا ہے اور نقل مقام اسکی عظمت وشان کبریائی کے منافی و محال ہے۔ اس قسم کے احادیث اور آیات کے بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ اللہ جل شانہٗ ہر ممکن پر قادر مطلق و متصرف بدون غیر ہے جو صرف اسی کی ذات کا اقتضا ہے۔ اب رہ گئی تیسری صورت وہ یہ ہے کہ یہ سب امور جن کے تذکرے قرآن و حدیث میں کئے گئے ہیں بطور تمثیل کے ہیں جن سے کچھ اور ہی مقصود ہے یا یوں کہئے کہ ان کا نہ تو حس ہی میں وجود ہے اور نہ خارج میں بلکہ محض سمجھانے کے لئے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں کہ جو شخص صرف قیاس آرائی ہی کرے اور اسی احتمال میں

ہو کہ یہ سب امور تمثیلی ہیں جن سے مطلب کچھ اور ہی ہے میں اس کو اہل حق سے نہیں سمجھتا۔

امام غزالیؒ نے عذاب قبر کے بارے میں ان تینوں متذکرہ مقامات سے بحث کی ہے کہتے ہیں میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ان تمام واقعات حدیث و قرآن کے ظاہری معانی و مفاہیم درحقیقت صحیح و درست ہیں ان میں اسرار ہیں جن سے اہل حق واقف ہوتے ہیں۔ یہ ایسے اسرار ہیں جو اہل بصیرت پر کھلے ہیں نیز کہ ان اسرار کا تا وقتیکہ پورا پورا حال معلوم نہ ہو جائے ان کے حقیقی معنی یعنی ظاہری معنوں سے انکار نامناسب ہے کیونکہ ایمان کا آخری درجہ اقرار اور تسلیم ہے۔

کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں عالم مثال سے متعلق تین مقاموں سے بحث ہے۔

مقام اوّل:۔ اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ ایک کافر ایک طویل مدت سے قبر کی چار دیواری میں پڑا ہوا ہے اور اس کو قرآن اور حدیث کی رو سے جو عذاب کہ دیا جانا یقینی ہے کیوں نہیں دیا جا رہا ہے اگر عذاب جاری ہے تو پھر اس کا غیر مرئی ہونا کیا معنی؟ تو اس لحاظ سے جو امر کہ مشاہدہ کے عین خلاف ہو اس پر بلا چون و چرا ایمان اور یقین کیسے کیا جائے ایسے امور کی تصدیق کی واسطے تین حالتیں ہیں۔ اظہر۔ اصح اسلم۔ یعنی یہ درست اور محفوظ ہے کہ یہ جمیع امور فی الحقیقت موجود ہیں سانپ بچھو اور دوسری ایذا رساں چیزیں اس کے حق میں موجود ہیں اور جن سے اس کو (مردہ) تکلیف پہنچ رہی ہے لیکن چونکہ ہماری بینائی قابل بصیرت نہیں اور اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ امور ملکیہ کا مشاہدہ کرسکیں۔ جو امور کہ عالم آخرت سے متعلق ہیں وہ ملکوتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس قول کی تفصیل اس طرح کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جبرئیلؑ کو ان دیکھے کس طرح ایمان لاتے تھے صحابہ کو اس امر کا کامل ایقان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیلؑ کو دیکھتے اور ان سے ہمکلام ہوتے تھے پس اگر کوئی مسلمان اس بات پر ایمان نہ لائے تو اصل ایمان کی تصحیح ملائکہ سے ہوگی اور وحی کا رتبہ زیادہ اہم ہے پس جب تم وحی پر ایمان رکھتے ہو اور کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام واقعات سریہ کا مشاہدہ کرتے

ہیں جن کا مشاہدہ امت محمدیہ نہیں کرسکتی تو اس لحاظ سے مردہ کی حالت کا انکار کس طرح کیا جاسکتا ہے نیز کہ جس طرح فرشتے آدمیوں اور حیوانوں سے مشابہ نہیں اسی طرح سانپ اور بچھو جو قبر میں مردہ کو گزند پہنچا رہے ہیں ہمارے اس عالم حسّی کی جنس سے نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق ایک جنس دیگر سے ہے اور ان کا ادراک بھی ایک دوسرے ہی حاسہ سے ہوگا۔

مقام ثانی:۔ ہم ایک سوتے ہوئے شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ آشنا و ناآشنا انسان عالی شان مکانات بازار گلی کوچہ میدان سرسبز کھیتیاں گنجان درخت دلفریب مناظر شاداب وادیاں بلند پہاڑ بہتے دریا غرضکہ سب کچھ جو عالم بیداری میں دکھائی دیتا ہے اپنے رویا میں دیکھتا ہے کبھی تو وہ خواب میں مسرور و شاداں ہیں اور ایسے شاداں کہ جس کا اثر حالت بیداری میں بھی باقی رہتا ہے اور مدتوں ذہن میں قائم رہتا ہے کبھی کوئی ایسے واقعہ یا سانحہ سے دوچار ہوتا ہے جس سے متاثر ہوکر خوف زدہ ہو جاتا ہے جس کا اثر جاگنے پر بھی زائل نہیں ہوتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے سونے والے کو سخت اذیت پہنچ رہی ہے جس کا وہ متحمل نہ ہوکر چیخنے چلانے آہ و بکا کرنے لگتا ہے جس سے پیشانی پر پسینہ بھی آجاتا ہے اور بحالت بے قراری اپنی جگہ سے اچھل پڑتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ان تمام امور کو اپنے حواس خمسہ میں سے ہر ایک کے ذریعہ اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح حالت بیداری میں۔ خواب میں یں وہی میں ہوں جو اس روئے زمین پر چلتا پھرتا ہوں کھاتا پیتا دیکھتا سنتا ہوں عالم رویا میں بھی وہی میں ہوں۔ کہ چلتا پھرتا کھاتا پیتا دیکھتا سنتا ہوں حالانکہ ایک دوسرا شخص اس خواب والے کو دیکھ رہا ہے کہ وہ چپ چاپ ہے اور اس کے پاس کوئی ایذارسان چیزیں ہی جمع نہیں۔ حالانکہ رویا میں اس کے حق میں وہ تمام ایذا رسانیاں موجود ہیں جن سے اس کو عذاب دیا جا رہا ہے۔ عذاب جو ہو رہا ہے اگر ڈسنے کی تکلیف کی وجہ سے ہو رہا ہے تو ہمارے تخیلی سانپ بچھو میں کوئی فرق ہی نہ رہے گا یعنی جب کاٹنے کا اثر تکلیف ہے تو سانپ کا خیالی ہونا یا فی الحقیقت نظر کے سامنے ہونا دونوں کی یکساں نوعیت ہے۔

مقام ثالث: یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ سانپ بذات خود کوئی تکلیف دہ چیز نہیں یہ زہر کی تکلیف ہے جو ایذا کا باعث ہو رہی ہے اور خود زہر بھی کوئی تکلیف دہ چیز نہیں بلکہ زہر کا اثر ہے جس سے حالت میں تغیر پیدا ہو رہا ہے تو معلوم ہوا کہ اگر بغیر زہر کے بھی ایسا ہی اثر پیدا ہو جائے تو اس نوع عذاب کی تعریف اور اندازہ یہ ہو سکے گا کہ اس کو اس سبب سے منسوب کیا جائے جس سے عادۃً اس قسم کی تاثیر کا ظہور ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص میں بغیر حلوا کھائے ہوئے شیرینی کی لذت پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں جب تک اس لذت کا کھانے کی طرف انتساب نہ کریں اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اضافت تعریف کیلئے بمنزلۂ سبب کے ہے اور اس طرح جو چیز ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ سبب کا نتیجہ ہوتی ہے ۔

سید محمود اکیلوی متعلم ام اے (ابتدائی)
شعبہ دینیات (کلام)

جانے کی خبر سُن کر

چراغِ شام تمنا بجھا رہے ہو تم ‏ ‏ ‏ کچھ اور درد محبت بڑھا رہے ہو تم
کسی غریب کی دنیا مٹا رہے ہو تم ‏ ‏ ‏ پرائے دیس کی قسمت جگا رہے ہو تم
وطن سے دور سنا ہے کہ جا رہے ہو تم

جنوں نواز گھٹائیں بھی ساتھ لے جاؤ ‏ ‏ ‏ گلوں کی شوخ ادائیں بھی ساتھ لے جاؤ
یہ بہکی بہکی ہوائیں بھی ساتھ لے جاؤ ‏ ‏ ‏ غرض وطن کی فضائیں بھی ساتھ لے جاؤ
وطن سے دور سنا ہے کہ جا رہے ہو تم

دلِ حزیں کا فسانا سناؤں گا کس کو ‏ ‏ ‏ جہانِ شوق میں اپنے بساؤں گا کس کو
منا کے مست گھٹاؤں میں لاؤنگا کس کو ‏ ‏ ‏ خدائے عشق و محبت بناؤں گا کس کو
وطن سے دور سنا ہے کہ جا رہے ہو تم

تمھیں فلک کے ستارے سلام کہتے ہیں ‏ ‏ ‏ گلوں کے مست اشارے سلام کہتے ہیں
حسین و شوخ نظارے سلام کہتے ہیں ‏ ‏ ‏ غمِ فراق کے مارے سلام کہتے ہیں
وطن سے دور سنا ہے کہ جا رہے ہو تم

غرور و ناز کی دنیا پہ چھاؤں گا اک دن ‏ ‏ ‏ بنائے قصرِ تغافل کو ڈھاؤنگا اک دن
یقین ہے کہ تمھیں بھی رلاؤں گا اک دن ‏ ‏ ‏ خدا گواہ کہ میں یاد آؤں گا اک دن
وطن سے دور سنا ہے کہ جا رہے ہو تم

خورشید احمد جامیؔ (حیدرآبادی)

دیسی بنک کاری

معاشیات

ہندوستان کی رپورٹ مردم شماری میں ہمیں ساہوکاروں اور دیسی بنکروں سے متعلق اعداد و شمار نہیں دستیاب ہوتے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لین دین کے کاروبار میں باشندگان ملک کی ایک معقول تعداد مشغول ہے بعض اشخاص تو ایسے ہیں جو صرف قرضہ دیکر اس پر سود حاصل کرتے ہیں بعض ایسے بھی افراد پائے جاتے ہیں جو نہ صرف عوام کو قرض دیتے ہیں بلکہ دوسروں کی رقومات بھی اپنے ہاں محفوظ رکھتے ہیں اور بالعموم اس پر ایک مناسب شرح سے سود بھی ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ہنڈیوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں ہم ہندوستانی ساہوکاروں کی دو طرح پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف قرض دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نہ صرف قرض دیتے، لوگوں کی رقومات، اپنے ہاں محفوظ رکھتے بلکہ ہنڈیوں پر بٹہ بھی کاٹتے ہیں اول الذکر قسم کے افراد ساہوکار کہلاتے ہیں آخر الذکر اشخاص کو دیسی یا ملکی بنکر کہا جاتا ہے۔

ساہوکاروں اور دیسی بنکروں میں یہ فرق ہے کہ ساہوکار صرف قرض دیتے ہیں اور اس کاروبار کے ساتھ ساتھ بالعموم تجارت بھی کرتے ہیں۔ برعکس اس کے دیسی بنکر علی العموم صرف لین دین کا کاروبار انجام دیتے ہیں۔ برخلاف ساہوکاروں کے وہ دوسرے اشخاص کی رقومات اپنے ہاں محفوظ رکھتے ہیں یہ رقومات ان کے ذاتی سرمایہ کا لحاظ کرتے ہوئے قلیل سہی تاہم رکھی ضرور جاتی ہیں اور نسبتاً ادنیٰ شرح سے ان پر سود بھی ادا کرتے ہیں۔ اس طرح دیسی بنکر بھی جدید بنکوں کی

طرح ایک حد تک پس انداز کنندوں اور حارفوں کے درمیان بالواسطہ طور سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ ادنی شرح پر رقومات محفوظ رکھتے ہیں۔ اور پھر انہی رقومات کو نسبتاً اعلی شرح سے حاجتمندوں کو دیتے لہذا انھیں ایک قسم کا منافع مل جاتا ہے۔ ساہوکاروں اور دیسی بنکروں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ ساہوکار ہنڈیوں پر بٹہ نہیں کاٹتے لیکن دیسی بنکروں کا یہ ایک اہم کام ہے۔ علاوہ ازیں دیسی بنکر ایک زر کے بدلے دوسرا زر بھی فراہم کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی روپیے کے عوض انگریزی پونڈ یا حالی کے عوض کلدار۔ ساہوکاروں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا سرمایہ عموماً قلیل ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ لوگ دیسی بنکروں کے ہاں سے کم شرح پر قرض حاصل کرکے زیادہ شرح پر عوام کو دیتے ہیں اور دونوں شرحوں کے فرق کو بطور منافع خود رکھ لیتے ہیں۔ بہرطور ساہوکار اور دیسی بنکر کے کاروبار کی نوعیت مختلف ہے اور ہر دو قسم کے پیشہ ور ہندوستان میں قدیم سے موجود ہیں۔

مکڈانل (Macdonnel) اور کیتھ (Keith) کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے۔ عہد وید (۱۴۰۰ - ۲۰۰۰ ق م) میں بھی قرض ستانی اور قرض دہی کاروبار جاری تھا۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ زر کا رواج نہ تھا اس لئے شرح سود بشکل اجناس ادا کی جاتی تھی۔

لیکن جہاں تک عہد سوترا (Sutra ۲ - ۷ ق م) کا تعلق ہے۔ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اس وقت تک زر کا رواج ہو چکا تھا۔ اور قرض دی ہوی رقومات پر شرح سود بشکل زر لیجانے لگی تھی شرح سود مختلف فرقوں کے لیئے مختلف تھی مثلاً برہمنوں اور کھتریوں سے ۲۴ اور ۳۶ فیصد لی جاتی تھی تو ویشوں سے اور شودروں سے ۴۸ اور ۶۰ فیصد۔

اس میں شک نہیں کہ ابتداً ساہوکار صرف رقومات قرض دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ عوام اپنی رقومات ان کے ہاں بھی محفوظ رکھوانے لگے جس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ ساہوں کاروں کے ہاں زیادہ محفوظ رہتیں۔ ساہوکار حفاظت کے کام کو بہت ہی عمدگی سے انجام دیتے رہے لیکن

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ تمام محفوظات یکساں طلب نہیں کئے جاتے تو انھیں حاجتمند افراد کو قرض بھی دینے لگے۔ اس طرح عوام کی رقمیں بیکار پڑے رہنے کی بجائے پیداآور کام میں لگنے لگیں ایسی صورت میں ساہوکاروں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ محفوظہ رقومات پر نسبتاً ادنی اشرح سے سود ادا کریں۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ دو تا پانچ سنہ عیسوی کے درمیان ساہوکاروں کے ہاں رقمیں محفوظ رکھنے کا طریقہ عام ہوگیا۔ تقریباً ہر معتبر ساہوکار کے ہاں تھوڑی بہت رقم محفوظ رہنے لگی۔ منو (Mann) کی تحریرات سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی رقومات کو ساہوکاروں کے ہاں محفوظ رکھواتے تھے۔ اس نے بطور خاص (Deposites and Pledges) کے عنوان پر ایک علحدہ فصل لکھی ہے جہاں تک شرح سود کا تعلق ہے وہ اس دور (عہد سوترا) میں بھی فرقوں کی نوعیت کے لحاظ سے ادا کی جاتی تھی۔

جب ساہوکاروں کے ہاں رقومات محفوظ رکھی جانے لگیں تو ان کے کاروبار بھی بنکوں کے کاروبار سے ملنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ساہوکار بھی بجائے مہاجن کہلانے کے دیسی بنکروں (Indigenous Bankers) کے نام سے موسوم ہوئے چھ تا سولہ سنہ عیسوی کے درمیان دیسی بنکروں کی حالت خاصی مستحکم ہوگئی تھی۔ ان کے تمول میں بہت ہی اضافہ ہوچکا تھا خصوصاً جین (Jain) بنکر بہت مشہور تھے۔ یہ لوگ مندروں وغیرہ کی تعمیر کے لئے کثیر رقومات صرف کرتے تھے چودھویں صدی عیسوی میں ملتانیوں کو لین دین کے کاروبار میں بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی چنانچہ دہلی میں ان کا بڑا اثر تھا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں (۸۸ - ۱۳۵۳ء) سرسوتی (جو دہلی سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر تھا) کے بنکروں نے حکومت کو کثیر رقم قرض دی تھی۔

وسط سترہویں صدی عیسوی میں ہمیں تیورنیر (Tavernier) کی تحریرات سے ہندوستانی بنکروں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مورخ مذکور لکھتا ہے کہ تقریباً ہر بڑے دیہات میں ایک ساہوکار کا پایا جانا لازمی تھا۔ یہ ساہوکار سراف کہلاتے تھے۔ یہ لوگ روپیہ پیسہ اور کوڑیوں کا مبادلہ کرتے اور ایک مقام سے دوسرے مقام کو رقومات روانہ کرنے میں بنکروں کا سا کام انجام دیتے تھے۔

عہد مغلیہ میں چونکہ مختلف اقسام کے سکہ مروج تھے لہذا انہیں نفع کمانے کے بہت زیادہ مواقع حاصل تھے۔ یہ سراف خانگی کاروبار کے علاوہ سرکاری دارالضرب میں دھاتوں کی جانچ پڑتال کرتے تھے اور انہیں اس کام کا معاوضہ دیا جاتا تھا علاوہ ازیں یہ لوگ تجارت خارجہ میں بھی مدد دیتے تھے۔

دور مغلیہ میں دیسی بنکروں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان کی بدولت حکومت کو ہر آڑے وقت امداد ملتی تھی دربار میں انکا کافی رسوخ تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں اس طرح ملتا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے مانک چند کو (جو اس زمانے کا بہت مشہور بنکر تھا) "سیٹھ" کا خطاب دیا تھا۔ مانک چند کے لے پالک بیٹے کو شہنشاہ فرخ سیر نے "جگت سیٹھ" کا خطاب عطا کیا تھا ان خطابات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دیسی بنکروں کی کیا کچھ اہمیت نہ ہوگی۔

خود ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ان بنکروں کے اچھے تعلقات تھے۔ یہ لوگ وقت ضرورت نہ صرف کمپنی کی مالی امداد کرتے بلکہ مالگذاری کی وصولی میں بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ انگریزوں اور دیسی بنکروں کے خوشگوار تعلقات کا پتہ اس طرح بھی ملتا ہے کہ لارڈ کلایو نے جگت سیٹھ کو چار یوم تک مہمان رکھا اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس مہمان داری میں سترہ ہزار سے زائد روپیہ صرف ہوئے۔

مختصر یہ کہ ساہوکاری لین دین کا کاروبار ہندوستان میں ویدوں کے زمانے سے مروج ہے۔ ترقی کرتے کرتے یہ کاروبار بنکوں کے کاروبار سے یکسانیت حاصل کرتا گیا بلکہ یہی دیسی بنکر رونما ہوئے۔ ان بنکروں کو دوسری صدی عیسوی سے بتدریج اہمیت حاصل ہوتی گئی حتیٰ کہ سولھویں صدی تک ان کا کافی اثر ہوگیا رفتہ رفتہ ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن اواخر اٹھارہویں صدی سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کاروبار میں آثار اضمحلال پیدا ہوگئے تھے۔ انگریزی تجارت میں ترقی اور انگریزی تسلط میں اضافہ کی وجہ سے مالی اداروں کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ اسی عہد سے انگریزی بنک کاری کا آغاز ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مختلف قسم کی بنکیں جدید طرز پر جاری ہوگئی ہیں تاہم دیسی بنکروں کی وجہ سے اب بھی ہندوستان کے کاروباری افراد کو کافی امداد بہم پہنچ رہی ہے۔ سنہ ۱۵ اور اس کے قرب وجوار میں ان کی تعداد فی دس ہزار ۲۵ سے زائد

اسی طرح گجرات اور اس کے اطراف واکناف میں ہر دس ہزار نفوس کے حساب سے ان کی تعداد ۲۰ اور ۲۵ کے درمیان ہے۔ پنجاب، لاہور اور ملتان میں ان کی تعداد فی دس ہزار نفوس پندرہ اور بیس کے درمیان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جدید بنکوں کے قیام کی وجہ سے دیسی بنکروں کی سابقہ اہمیت نہ سہی تاہم ان کے وجود سے جو فوائد کہ ملک کو حاصل ہو رہے ہیں وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

یہاں تک تو ہم نے ساہوکاروں اور دیسی بنکروں کے مابین فرق معلوم کرتے ہوئے یہ معلوم کیا کہ ہندوستان میں سودی لین کے کاروبار کی ابتدا کب ہوئی، دیسی بنکروں کا وجود کیونکر عمل میں آیا، ان کے کاروبار کو کیونکر ترقی ہوئی، ان کے تمول میں کس طرح اضافہ ہوا، دور مغلیہ میں انھیں کیا اہمیت حاصل تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کے کیسے خوشگوار تعلقات تھے اوا خر اٹھارہویں صدی میں انھیں کیونکر زوال ہوا لیکن اس کے باوجود بھی موجودہ زمانے میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ اب ہم ان کے کاروبار اور طریق کاروبار پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے یہ دریافت کرینگے کہ ان کے کاروبار میں کیا اچھائیاں ہیں اور کیا برائیاں۔ آخر میں ہم یہ معلوم کریں گے کہ دیسی بنکروں کا تعلق ریزرو بنک کے ساتھ قائم کرنے سے ان کے ذخائر سے متعلقہ نقائص کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پیچھے معلوم کر آئے ہیں دیسی بنکروں کے تین اہم فرائض ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ عوام کو قرض دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عوام کی رقومات اپنے ہاں محفوظ رکھتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ منڈیوں کی خرید و فروخت بھی کرتے ہیں۔ آئندہ اب ہم ان ہر سہ امور کی تشریح کریں گے۔ جہاں تک قرض دینے کا تعلق ہے وہ حسب ذیل طریقوں پر دیا جاتا ہے۔

۱۔ بذریعہ پرامیسری نوٹ:۔ اس طریق کے تحت قرض گیر سے یہ لکھوا لیا جاتا ہے کہ وہ حاصل کردہ اصل اور اس کا سود جب کبھی طلب کیا جائے ادا کردیگا۔ معاہدہ کے کاغذات پر ٹکٹ بھی لگانا پڑتا ہے اور رقومات کی نوعیت کے لحاظ سے ٹکٹ کی قیمت زیادہ او کم ہوتی ہے۔ بڑی بڑی رقومات کے لین دین میں قرض گیر سے ضمانت بھی لی جاتی ہے۔

۲۔ بذریعہ رسید:۔ قرض دہی کا دوسرا طریقہ رسید کے ذریعہ ہے۔ اس میں قرض گیر سے صرف یہ لکھوا لیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مقررہ رقم ایک خاص شرح سے حاصل کی ہے پرامیسری نوٹ اور رسید کے طریقہ میں یہ فرق ہے کہ رسید میں ضمانت نہیں لی جاتی بلکہ صرف گواہی پر اکتفا کیا جاتا ہے

۳۔ بذریعہ دستاویز:۔ قرض دینے کا ایک تیسرا طریقہ بذریعہ دستاویز ہے۔ پرامیسری نوٹ اور دستاویز کے طریقے میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر طریقہ میں قرض ستانی سے متعلقہ امور نہایت اختصار سے درج ہوتے ہیں مگر دستاویز میں ان تمام امور کا مفصل ذکر ہوتا ہے۔ دستاویز کا طریقہ زیادہ محفوظ تصور کیا جاتا ہے اور عام طور پر اس کے ذریعہ قرض دیا جاتا ہے۔

۴۔ بذریعہ کھٹ بہی:۔ بعض بنکر اپنی مخصوص بہیاں رکھتے ہیں۔ آسامیوں سے علحدہ رسید یا دستاویز حاصل کرنے کے بجائے بہی میں یہ لکھوا لیتے ہیں کہ اس نے اس قدر رقم حاصل کی ہے۔ اس بہی میں صرف حاصل کردہ اصل کا اندراج ہوتا ہے شرح سود اور دیگر امور کا تصفیہ زبانی ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ کھٹ بہی کا طریقہ زیادہ ترساہوکاروں سے متعلق ہے۔

۵۔ بذریعہ رہن:۔ مذکورۂ بالا طریقوں کے علاوہ بذریعہ رہن بھی رقومات قرض دی جاتی ہیں رہن دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک رہن بالقبض دوسرے رہن بالوفا۔ اول الذکر حالت میں مرہونہ جائداد قرض دہندے کے قبضہ میں دے دی جاتی ہے وہ اصل کی وصولی تک اس کے منافع سے مستفید ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں جائداد قرض گیر ہی کے قبضہ میں رہتی ہے مگر وہ مقررہ شرح سے سود ادا کرتا رہتا ہے۔

۶۔ بذریعہ اقساط:۔ قرض دینے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ جس قدر رقم قرض دی جاتی ہے اس کو یکمشت نہیں وصول کیا جاتا بلکہ اصل اور سود کی ادائی بذریعہ اقساط ہوتی ہے۔ یہ طریقہ زیادہ مروج ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے قرض گیر کا بار مختلف حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

مذکور طریقوں کے علاوہ ہاتھ ادھار، بٹائی، لاونی اور چالو کھاتہ کے ذریعہ بھی قرضے

دئے جاتے ہیں۔ ہاتھ ادھار میں کسی قسم کی لکھائی پڑھائی نہیں ہوتی بلکہ صرف قرض گیر کی ساکھ پر رقم دی جاتی ہے۔ ساہوکار کسان کو بیج اور روپیہ کے ذریعہ مدد کرتا ہے۔ کاشت کے بعد جس قدر بھی غلہ حاصل ہو وہ نصف نصف تقسیم کرلیا جاتا ہے۔ لاؤنی کے طریق میں یہ ہوتا ہے کہ فصل کی کٹائی سے قبل جب کسان کو روپیے کی ضرورت ہوتی ہے تو ساہوکار اس کو اس معاہدہ پر رقم قرض دیتا ہے کہ کٹائی فصل کے بعد وہ جملہ اجناس یا ان کے ایک حصہ کو قیمت مقررہ سے فروخت کرے گا۔ اور یہ قیمت عموماً بازاری قیمت سے ۵۰ یا ۴۰ فی صد کم ہوتی ہے۔ چالو کھاتے میں ساہوکار قرض گیروں کو روپیہ نہیں دیتے بلکہ غلہ دیتے ہیں۔ ان اشیا کی قیمت پر باضابطہ سود وصول کرتے ہیں لیکن یہ چاروں طریقے بیشتر ساہوکاروں سے متعلق ہیں جو دیہاتوں اور شہروں میں لین دین کا کاروبار کرتے ہیں۔

شرح سود کے متعلق ۶ فی صد جائز شرح قرار دی گئی ہے۔ مگر نوعیت قرضہ کا لحاظ کرتے ہوے عموماً اس سے زیادہ وصول کی جاتی ہے۔ دیسی بنکر عوام کو نسبتاً زیادہ اور چھوٹے ساہوکار (جو ان کے ہاں سے قرض حاصل کرتے ہیں) نسبتاً کم شرح سے قرض دیتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر یہ سنا جاتا ہے کہ یہاں پر شرح سود بہت زیادہ وصول کی جاتی ہے۔ اس پر غور کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ لین دین کا کاروبار کرنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مہاجن یا ساہوکار دوسرے بنکر۔ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مہاجن عموماً بہت زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں خصوصاً دیہاتوں میں یہ شرح بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن جہاں تک دیسی بنکروں کا تعلق ہے ان کی شرح بالعموم مناسب ہوتی ہیں۔ نوعیت قرضہ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ شرح ۸ سے ۱۲ فی صد ہوتی ہے۔ خاص خاص صورتوں میں جب کہ ضمانت ٹھیک نہیں ہوتی تو ۱۲ سے $37\frac{1}{2}$ فی صد تک وصول کی جاتی ہے۔

دیسی بنکر قرضے دینے کے علاوہ دوسروں کے رقومات بھی اپنے ہاں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر ان بنکروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بنکوں کی طرح ان کے کاروبار کا مدار محفوظات پر نہیں

ہوتا بنکوں کے لئے محفوظات (Deposits) کا سوال بہت اہم ہے۔ دیسی بنکروں کے ہاں چونکہ سرمایہ ان کا ذاتی ہوتا ہے اس لئے انھیں محفوظات کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہوتی جو رقومات کہ وہ اپنے ہاں محفوظ رکھتے ہیں عموماً بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہیں اور وہ بھی بیشتر ان کے عزیز و اقارب کی ہوتی ہیں جو مجبوریوں کے تحت لین دین کا کاروبار نہیں کر سکتے۔

دیسی بنکر محفوظات پر سود بھی ادا کرتے ہیں۔ درجہ اول کے بنکر، ۳/۴ فی صد ماہانہ یا ۵ ۱۳/۱۶ فی صد سالانہ سے زیادہ نہیں ادا کرتے۔ درجہ دوم کے بنکر ۱۰ر فی صد ماہانہ یا ۷ ۱/۲ فی صد سالانہ تک بھی ادا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ابتدائً جب رقومات محفوظ رکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا اس وقت محفوظات پر بالعموم کوئی سود ادا نہیں کیا جاتا تھا۔

دیسی بنکر رقومات قرض دینے اور دوسروں کی رقومات اپنے ہاں محفوظ رکھنے کے علاوہ ہنڈیاں بھی لکھتے ہیں ان ہنڈیوں کی وجہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک رقومات روانہ کرنے میں سہولت ہوتی ہے (قبل اس کے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ ہنڈیاں کیونکر لکھی جاتی ہیں مختصر طور سے یہ معلوم کرین گے کہ ہنڈیوں اور مبادلہ بل (Bill of Exchange) میں کیا فرق ہے۔

ہنڈی اور مبادلہ بل ایک نہیں بلکہ ان میں مطابقت اور ساتھ ہی ساتھ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ مطابقت اس طور پر پائی جاتی ہے کہ مبادلہ بل کی طرح ہنڈی میں بھی ایک لکھنے والا ہوتا ہے دوسرے وہ شخص ہوتا ہے جسکے نام ہنڈی لکھی جائے اور تیسرے ہنڈی رکھنے والا ہوتا ہے۔ مبادلہ بل کیطرح ہنڈی پر بھی ٹکٹ لگایا جاتا ہے جس کی قیمت مندرجہ رقم کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ اور کم ہوتی ہے

دونوں میں فرق یہ ہے کہ مبادلہ بل کا مضمون کاروباری ہوتا ہے لیکن ہنڈی کی نوعیت خط و کتابت کی سی ہوتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہنڈی اندرون ملک وہی سہولت بہم پہونچاتی ہے جو بل آف اکسچینج بیرون ملک۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ ہنڈی کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت پیشگی رقومات (Advances) حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہنڈی زیادہ چک سے مشابہ ہے نہ کہ مبادلہ بل سے۔

ہنڈی دراصل ایک قسم کا خط ہے جس میں ایک مقام کا بنکر یا تاجر دوسرے کے بنکر یا ایجنٹ کو یہ لکھتا ہے کہ وہ مندرجہ رقم ایک خاص مدت کے بعد یا فی الفور حامل ہذا کو مقام ادا کردے گا۔

جس طرح مبادلہ بل خریدی اور فروخت کی جاتی ہیں اسی طرح ہنڈیوں کی بھی خریدی و فروخت کیجا سکتی ہیں بعض بنکر ہنڈیاں نہیں لکھتے بلکہ صرف خرید و فروخت کرتے ہیں خصوصاً ملتانی بنکر اس کام میں ماہر ہوتے ہیں ہنڈیوں پر عموماً ۶ تا ۹ فی صد کے درمیاں بٹہ کاٹا جاتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے دیسی بنکروں کے فرائض اور طریق کاروبار کو معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اب اس امر پر روشنی ڈالیں گے کہ ان کے کاروبار میں کس قسم کی اچھائیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک ان کے کاروبار کی اچھائیوں کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا طریقہ حساب وکتاب بہت ہی سیدھا سادا ہوتا ہے ان کے ہاں آسامیوں کو قرضہ حاصل کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ جد وجہد نہیں کرنی پڑتی۔ قرض حاصل کرنے کا عام طور پر کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا اس لئے آسامیوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں بنکر کے ہاں پہنچکر قرض کا مطالبہ کرسکتے ہیں ان کے کاروبار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ موجودہ بنکوں کے کاروبار کی طرح پیچیدہ نہیں ہوتے حساب وکتاب کے لئے ان کے ہاں ضرورت سے زائد دفتر نہیں ہوتے مختلف بہیاں (Bahis) رکھی جاتی ہیں مثلاً روکڑ بہی اور کھاتہ بہی وغیرہ۔ جدید بنکوں کی طرح دیسی بنکروں کی بھی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر روز شام میں نقد اور قرض دی ہوی رقومات کا میزان لگاکر دیکھ لیا جاتا ہے کہ اصل رقم برابر ہے یا نہیں بعض بنکر تو جب تک حساب وکتاب پورا نہیں کرلیتے شام کا کھانا نہیں کھاتے۔ بہرطور دیسی بنکروں کا طریقہ حساب وکتاب بہت ہی تشفی بخش ہوتا ہے اور ان کے ہاں سے قرض حاصل کرنے میں زیادہ طوالت نہیں ہوتی۔

لیکن ایک عام اعتراض جو دیسی بنکروں پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ ان کے ہاں رقومات

محفوظ رکھنے کا کافی انتظام نہیں ہوتا جس کی وجہ سے لوگوں کو ترغیب نہیں ہوتی کہ اپنی رقومات انکے ہاں محفوظ رکھائیں۔ اس نقص کی وجہ سے ملک کو ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی رقومات لوگوں کے ہاں اندوختوں کی شکل میں بیکار پڑی رہتی ہے۔ دیسی بنکر اگر ان رقومات کو جمع کرکے کاروباری افراد کو قرض دیں تو اس سے اگر ایک طرف جمع کنندوں کو کچھ سود مل جاتا ہے تو دوسری طرف خود قرض گیر کے لئے بھی سہولت بہم پہنچتی۔ علاوہ ازیں بنکروں کا بھی فائدہ ہوجاتا ہے۔ چونکہ دیسی بنکر زیادہ تر اپنا ذاتی سرمایہ کاروبار میں لگاتے ہیں اس لئے ملک کی ایک قابل لحاظ رقم منتشر اور بیکار رہتی ہے۔

علاوہ ازیں دیسی بنکروں کے کاروبار کا ایک اور نقص یہ ہے کہ وہ بجائے خود اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی یہ کہ وہ اپنا کاروبار انفرادی طور پر کرتے ہیں اور انجمنہائے سرمایہ مشترک سے انکا بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ بعض بعض مرتبہ جب کہ ان کے ہاں رقم کی کمی پڑتی ہے تو یہ لوگ مذکورہ انجمنوں سے قرض حاصل کرتے ہیں۔ سرد بازاری کے زمانہ میں ان کے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ بیکار پڑا رہتا ہے۔

دیسی بنکر چونکہ انفرادی طور پر کاروبار کرتے ہیں اس لئے ان کے ذخائر منتشر رہتے ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے ایک دقت یہ پیش آتی ہے کہ اگر ایک مقام پر کاروبار سرد بازاری کی وجہ سے سرمایہ کی طلب کم ہوجائے تو اس ذخیرے کو ایسے مقام پر منتقل نہیں کیا جاسکتا جہاں کہ اس کی مانگ ہو۔

جنگ عظیم کے بعد سے تاریخ عالم شاہد ہے کہ کسی ملک کی بنک کاری کا نظام اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس ملک کے مرکزی بنک اور دیگر مالی اداروں کے درمیان ایک منظم رشتہ نہ ہو۔ ہندوستان میں جہاں کہ بنک کاری کا طریق اس قدر غیر منظم حالت میں ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف ساہوکاروں بلکہ دیسی بنکروں اور مرکزی بنک میں مستقل ربط ضبط پیدا کیا جائے۔

رزرو بنک کے گورنر مسٹر بی۔ بی ٹیلر (Talor) نے اپنی ایک نوٹ میں تبلایا ہے کہ دیسی

بنکروں اور رزرو بنک میں اس وقت رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے جب کہ حسب ذیل تدابیر اختیار کی جائیں:۔

۱۔ دیسی بنکروں کو چاہئے کہ وہ اپنے کاروبار کو باضابطہ بنک کاری کے اصول پر چلائیں لین دین کے کاروبار کے ساتھ ساتھ کسی دوسری قسم کا کاروبار جاری نہ رکھیں۔

۲۔ ان کو چاہئے کہ اپنے لین دین کا باضابطہ حساب وکتاب رکھیں اور وقت ضرورت رجسٹرار اکونٹنٹ کے ہاں پیش کریں۔ رزرو بنک کو اس کا حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ جب چاہے دیسی بنکروں کے حساب وکتاب کی تنقیح کرے اور حسب ضرورت ان سے متعلقہ مواد طلب کرے۔

۳۔ ان کو چاہئے کہ (Periodical Statement) رزرو بنک میں رکھوائیں علاوہ ازیں انھیں چاہئے کہ رقومات محفوظ رکھوانے والوں کے مفاد کی خاطر باضابطہ (Returns) طبع کروایا کریں۔

۴۔ رزرو بنک کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ جب کبھی ضروری سمجھے بنکروں کے کاروبار کی تصحیح (Regulate) کرے۔

۵۔ دیسی بنکر جب رزرو بنک سے اپنا تعلق قائم کرلیں گے تو تاریخ داخلہ سے پانچ سال بعد ہر بنکر کو اس کا حق ہوگا کہ جہاں کہیں رزرو بنک کا کاروبار جاری ہو وہاں اپنا حساب کھولے۔

۶۔ اگر کوئی دیسی بنکر کمپنی اکٹ (Companies Act) کی بموجب خود کو رزرو بنک کا رکن نہ بنالے تو اس کی ذمہ داری غیر محدود ہوگی۔ لہذا اس کو اس امر کی وضاحت کرنی پڑے گی کہ بنک کاری کے لئے اس کے ہاں کس قدر سرمایہ ہے جن بنکروں کا سرمایہ دو لاکھ سے کم ہو وہ رزرو بنک کی رکنیت کے لئے درخواست نہ دیں۔

۷۔ جب کبھی ضرورت ہو تو انھیں حسب ذیل امور کی تشریح کرنی ہوگی۔

الف ۔ اگر ان کے کوئی حصہ دار ہوں تو ان کے نام اور ان کے کاروبار کی وسعت

ب ۔ اگر کوئی بنکر ہندو مشترک خاندان کا رکن ہو تو ان کے نام اور کاروبار میں انکا

مفاد (Interest) ہر دو صورتوں میں دیگر اراکین خاندان سے اس کی تشریح کروانی ہوگی کہ وہ بنک کے کاروبار میں پورا پورا (Full) حصہ لیں گے نہ صرف یہ بلکہ ذمہ داری (Liability) کی حد تک بھی ان کا تعلق رہے گا۔

۸۔ مذکورۂ بالا طریقہ امتحاناً پانچ سال کے لئے رائج کیا جائیگا۔ لیکن اس عرصہ کے ختم ہونے سے قبل ہی اگر رزروبنک ضروری سمجھے تو دیسی بنکروں سے مستحکم رشتہ قائم کرنے کے لئے دوسرا قانون بنا سکتا ہے۔

۹۔ اگر دیسی بنکر مذکورۂ بالا تمام امور کی پابندی کریں تو انھیں دوبارہ ہنڈیوں پر بٹہ کٹوانے کا حق ہوگا رقومات کے بھیجنے میں جو سہولتیں کہ شیڈیولڈ (Scheduled) بنکوں کو حاصل ہیں وہ انھیں بھی حاصل رہیں گی۔ علاوہ ازیں انھیں اس کا بھی حق حاصل رہے گا کہ وہ سرکاری کاغذات کی طمانیت پر پیشگی رقومات حاصل کر سکیں گے۔

محمد ناصر علی۔ ایم۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبۂ معاشیات

شانِ امتیاز

کمسنی معصومیت کا امتزاج — نکہت گل کی صدائے احتجاج
سادگی اور طرفہ یہ سنجیدگی — اک مجسم حسن کی تابندگی
ہیں اداؤں میں محبت ہی کے راز — اور نگاہوں میں خمارِ دلنواز
ہر نفس میں عشق کے پنہاں شرار — ہر تکلم میں ترنم بے قرار
ہر تبسم جلوۂ صد انقلاب — ہر تصور جس کا سحر آلود خواب
ہر قدم پر لغزشِ حسن و جمال — ہر تڑپ میں برق و باراں کا جلال
ہر اشارا مژدۂ ذوقِ وفا — ہر سخن گویا جوابِ مدعا
اک پیامِ زیست ہے جنکا وجود — بھیجتا ہوں جن پہ الفت کے درود

کچھ نہ پوچھو کیا ہے شانِ امتیاز
بارگاہ حسن کے راز و نیاز

عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)
سابق طالب علم

عدد اور صفر کی ایجاد

ریاضی کی بنیاد تعداد اور اعداد پر ہے۔ تعداد اور اعداد کا سنگ بنیاد "ایک" ہے۔ اکائی کا جو سبق مسلمانوں نے سیکھا اور جس سے ساری دنیا کو روشناس کرایا وہ کبھی صفحہ عالم سے محو نہیں ہوسکتا۔ ایک ایسی استوار بنیاد، ریاضی کی مستحکم عمارت کی اساسی تعمیر ایک خلاف توقع نتیجہ نہیں ہوسکتی۔

اسلامی دنیا میں دو طرح کے ہندسے مروج ہیں۔ ا، ۲، ۳، ۴، اور دیگر 1,2, 3,4 اول الذکر تھوڑے سے تغیر سے فارسی اور عربی تحریر میں مستعمل ہیں۔ اس امر کی تحقیق اب تک نہ ہوسکی کہ کب اور کس ملک میں یہ ہندسے اولاً ایجاد ہوئے۔ غالباً عرب میں بہرحال انکی ساخت سے ظاہر ہے کہ ان کی شکل انگلیوں کے ذریعہ اعداد کو سمجھانے کا نتیجہ ہے۔

دوسرے ہندسے جو فی زمانہ تمام یورپ کے ہر حصہ میں کم و بیش رائج ہیں اور بین الاقوامی حیثیت و شہرت رکھتے ہیں انکے متعلق بلا شک و شبہ قطعی طور پر امر مسلمہ ہے کہ یورپ نے یہ ہندسے ان شکلوں میں اندلس کے عربوں سے حاصل کئے اور یہی ہندسے ہسپانیہ کی اسلامی جامعات کے آخری زمانہ میں مستعمل تھے۔ ان کی شکلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انگلیوں کے اشارے سے گنتی سیکھنے کے اصول پر نہیں بلکہ درحقیقت تحریری طور پر لکیریں کھینچ کر اعداد کا تعین کرنے کے اصول پر مبنی ہیں۔

ا، ح، ح وغیرہ۔ بعد کے ہندسوں کی اشکال اس قدر طویل زمانہ گزرنے کی

وجہ سے اپنی ہیئت اصلی بدل چکی ہیں۔ بعد کی شکلیں ان اعداد کے ناموں کے پہلے حروف سے حاصل کی گئی ہیں یا کسی اور طرح سے ــــ اس امر کے متعلق بہت سے نظرئے قائم کئے گئے ہیں لیکن وثوق کے ساتھ کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔ مگر یہ امر حیرت انگیز ہے کہ یہ اشکال ایک طرف تو دنیا کے انتہائے مغرب میں مستعمل ہیں اور دوسری طرف قدیم ہندوستان کے دیوناگری ہندسوں سے تعجب خیز مشابہت رکھتی ہیں۔

اس مشابہت کی بنا پر یہ کہنا کہ ان ہندسوں کا وجود ابتداً ہندوستان میں ہوا غیر محقق چیز ہوگی چونکہ جس زمانہ میں یہ ہندسے ہسپانیہ کی جامعات میں پرورش پا رہے تھے اس زمانہ میں ہندوستان کے طول وعرض میں کئی اقسام کے بے شمار ہندسے مستعمل تھے اور جن کی اشکال میں تغیر اور تبدیلی اس سرعت کے ساتھ ہو رہی تھی کہ تجارتی دنیا میں اس کا استعمال خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے اطالیہ میں یہ ہندسے حکماً بند کردئے گئے۔ اور خود ان اعداد کی اشکال دسویں صدی کے آخر تک معین نہ تھیں[1]۔

خواہ حقیقت کچھ ہی ہو یعنے کسی ملک نے یہ اشکال مقرر کئے ہوں اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ موجودہ زمانہ میں ان اشکال کی بین الاقوامی حیثیت اور ترقی اور ترویج میں یورپ اندلس کے عربوں کا رہین منت ہے۔

صفر کی ایجاد:۔

صفر کی ایجاد اور استعمال علم حساب کی تاریخ میں ایک اہم باب کو نشان زد کرتا ہے اور وہ یہ کہ کثیر و بڑی رقموں کو، پاس پاس ہندسے لکھکر صرف نو ۹ ہندسوں کی مدد سے ظاہر کرسکنا ممکن ہوا۔

اس کے بغیر اور اس لئے اس کی ایجاد کے قبل جمع و تفریق کا عمل بہت دشوار طریقوں پر

---

[1] اسمتھ صفحہ ۷

مبنی اور رائج تھا۔ اور اس عمل کے لئے (Abacus) کا طریقہ مختلف اقوام میں بالخصوص ہندوستان میں کثرت سے رائج تھا۔ یورپ میں بھی Abacus کا رواج گزشتہ ڈہائی سو سال کے آخر تک رہا۔ یہ مقام حیرت ہے کہ عربوں کے ابتدائی زمانہ کی تصنیفات میں بھی صفر کا استعمال موجود اور (Abacus) کا طریقہ مفقود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ایجاد کا سہرا عربوں کے سر ہے۔

وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم یورپ میں اس کی ترویج عربوں کی کتب ریاضی کے ترجمے سے شروع ہوئی۔ ''صفر'' کے معنی ''خالی'' ہیں۔ اور مقامی قیمت کے تعین میں کسی خاص مقام کی نشان زدگی کیلئے اسکا استعمال اور مفہوم لفظ ''صفر'' بمعنی ''خالی'' کے ساتھ غیر معمولی مطابقت رکھتا ہے۔ نیز ''صفر'' کے معنی عربی زبان میں ''کتکب'' کے بھی ہیں ''کوئی چیز جو لکھی جائے''۔ چنانچہ ابی بن اعزا نے سنہ ۱۱۴۰ء میں ایک کتاب اکائی پر لکھی تھی جس کا نام Book of Unity) انگریزی زبان کا لفظ Cipher خود اسی لفظ سے ماخوذ ہے نیز لاطینی لفظ Zero کے معنی بھی خالی کے ہیں۔ جو صفر کا تحت لفظی ترجمہ ہے نشاۃ الثانیہ Renaissance کے ساتھ ہی صفر مستعمل ہونا شروع ہوا صفر کی ایجاد اور ہندسوں کی مقامی قیمت کے تعین کیلئے اس کا استعمال رائج ہو جانے کے بعد اعشاریہ کے حسابات کا جاری ہونا ایک قدرتی نتیجہ تھا لیکن اسکی ترویج میں دیر ہوئی۔ پہلے پہل اعشاریہ کسروں کے استعمال کا سہرا الکاشی (سنہ ۱۴۳۶ء) کے سر ہے جو مرش الغ خان کا مددگار تھا اور جو سمرقند کی رسدگاہ کا ناظم تھا اسکی کتاب ''رسالۃ المحیط'' میں جو پایہ کی تصنیف ہے یہ کسر استعمال کی گئی۔

پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے آثار طلوع ہو چکے تھے یورپ ایک تشنہ کام کیطرح علم کے سرچشموں کی تلاش میں سرگردان پھرنے لگا۔ ان کو سوائے اس کے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ غرناطہ ٹولیڈو اور قرطبہ کی جامعات کی کتابوں کے ترجمے کر دئے جائیں چنانچہ

یہ ترجمے جن میں تلفظ کے ذرا سے اختلاف کے ساتھ عربی الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ایک طویل مدت تک یورپ کی جامعات میں نصابی کتب کی حیثیت میں استعمال ہوتے رہے۔

الجبرا کی علامتیں (Symbols) بھی اسی طرح مروج ہوئیں۔ مثال کے طور پر یہ علامات جذر کا استعمال نیز جبریہ مساوات کو تحریر کرنے کا طریقہ بالکل عربی طریقہ کی نقل تھی۔ ان مترجمین میں سے جنھوں نے کثیر تعداد میں نایاب عربی کتابوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا چار بہت مشہور ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

1. Regromonte
2. Germus
3. Adilard of Buth
4. Leonbard of Pisa

صفر کی ایجاد نے علوم ریاضیہ کے دور میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس کی استوار بنیادوں پر ریاضیات کی عمارت ایستادہ ہے۔

"صفر! جس کی قیمت "کچھ نہیں" ——— لاقیمت ہے۔

محمد عظیم الدین
بی۔ اے۔ (آخری)
ریاضیات

فرزندِ جامعہ سے خطاب

نونہالِ جامعہ اے نازشِ خاکِ وطن — تیرے دامن میں مچلتی ہے بہارِ علم و فن
جگمگاتا ہے جبیں پر تیری مستقبل کا راز — تیرے ہر انداز سے ظاہر ہے شانِ امتیاز
مشرقی تہذیب کا تو ہی علمبردار ہے — تجھ سے دنیائے عمل اک مطلعِ انوار ہے
تو تمناؤں کے رنگیں خواب کی تعبیر ہے — ہر قدم سعیٔ عمل ہر فکر اک تدبیر ہے

زندگی ہے قوم کی دراصل تیری زندگی
دیکھ تیری ذات پر آنکھیں لگی ہیں قوم کی

اٹھ کہ اپنے قلب کے زخموں کو سینا ہے تجھے — دیکھ دنیا کو اسی دنیا میں جینا ہے تجھے
دور کر سکتے نہیں تاریکیوں کو دل کے داغ — بزمِ عالم میں جلا پھر اپنی ہمت کے چراغ
عزم والوں کے لئے ہے سربلندی کا پیام — وقت کے مضبوط ہاتھوں میں ہے امیدوں کا جام
رشتۂ اوہامِ باطل توڑ دینا چاہیئے — بے حسی کی زندگی اب چھوڑ دینا چاہیئے
شوقِ منزل ہے تو بڑھ منزل کی جانب بے خطر — کامیابی ہے تری آمد کی خود ہی منتظر
ایک عزمِ آہنی ہوتا ہے بس جانِ عمل — پھر سمجھ لے ہے کھلا دنیا کا میدانِ عمل
زندگی طوفان ہے طوفان سے گذرنا ہے تجھے — قوتِ بازو سے اپنے ہی ابھرنا ہے تجھے
پرورش کر دامنِ ہمت میں اسرارِ حیات — اک زمانے کی امیدوں کا ہے مرکز تیری ذات

مختصر یہ ہے کہ پیدا کر وہ شانِ امتیاز
جس پہ ہو اہلِ وطن خاکِ وطن کو فخر و ناز

امیر احمد خسرو بی۔اے (آخری)

سگنڈ فرائڈ

سگنڈ فرائڈ اس صدی کا ایک ممتاز ترین فلسفی حکیم ہے جس کی تعلیمات، معتقدات اور وجدانات، فلسفہ کی دنیا میں ایک مہتم بالشان مقام رکھتے ہیں۔ فرائڈ ۱۸۵۶ء میں آسٹریا پیدا ہوا، یہ ایک صیہونی (Jew) ہے۔ فرائڈ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا نے کارل مارکس کے بعد سب میں بڑا مفکر، فلسفی اور حکیم اسی کو پیدا کیا ہے۔ فرائڈ کے علمی کارناموں کی وقعت کا اندازہ اس ایقان سے بھی کیا جاتا ہے کہ "تحلیل نفسی پر اس کی تحقیقات کو نتائج کے اعتبار سے صنعتی انقلاب اور امریکہ کی دریافت کے نتائج سے بھی ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کی طرح کہ اقبال اور ٹیگور میں کون ممتاز ہے، یورپ کی بہت ساری انجمنوں سے اس موضوع پر مباحثے کئے کہ اس صدی کی عظیم شخصیتوں ہٹلر، اور فرائڈ میں کون ممتاز ہے۔

فرائڈ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۸ء تک وائنا یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر رہا ہے یہ نفسیات کے موضوع پر ایک مقتدر علمیت اور قابلیت کے مالک ہیں۔ فرائڈ کا آرٹ اور ان کی تعلیمات کا کمال علم تجزیہ نفس (Psycho Analysis) ہے۔ فرائڈ اس نئے علم کا بانی ہے اور اپنی طویل زندگی میں اس نئی تحقیق کو کامیابی کے تمام مدارج سے گزار کر ایک رفیع مقام پر پہنچا دیا۔ "تحلیل نفسی" کی کامیابیوں کا اندازہ، اس امر سے کیا جاتا ہے کہ جدید سیاسی نظریئے نیا ادب، اور فلسفہ کے تمام اصول و آئین اس سے مربوط ہوتے جا رہے ہیں۔

"تحلیل نفسی" کی تحقیق میں فرائڈ نے یہ معلوم کیا ہے کہ "افراد کی ہر شعوری حرکت کی تہہ میں

افراد کا ذہن غیر شعوری طور پر کارفرما رہتا ہے اور ہماری ہر حرکت اسی کا ایک راست اور لازمی نتیجہ ہے" فرائڈ نے اپنی تحقیقات کا مدار انسان کی غیر شعوری حرکتوں کو قرار دیا۔ اس پر برسوں تحقیق اور تجربہ کرتا رہا اور نتیجہ کے طور پر دنیا کے سامنے اپنی محنت کا ماحصل پیش کیا کہ "ہماری تمام شعوری حرکتیں غیر شعوری حرکتوں کا ایک عکس یا راست نتیجہ ہیں"۔ "تحلیل نفسی" کے متعلق مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ علم ان تمام ذریعوں اور راہوں کی تحقیق اور دریافت کرتا رہتا ہے کہ جنکی مدد سے انسان کی غیر شعوری خواہشیں اور حرکتیں عمل پذیر ہو کر اپنی تسکین کی کوشش کرتی رہتی ہیں

فرائڈ نے جب اپنے لئے اس کام کو منتخب کیا ہے وہ ماحول کا ایک اثر اور وقت کا ایک محکم تقاضا تھا، جس نے فرائڈ کو اس کام کے لئے پیش کیا ہے۔ اس وقت سیاسی اور سماجی زندگی کا انتشار ہر صاحب فکر کے لئے ایک موضوع تھا کہ ایسے اسباب تلاش کئے جائیں کہ انسانیت آسودگی حاصل کرے۔ مشہور عالم ادیب اور فلسفی ہیولاک ایلس Havelock Ellis نے سچ کہا ہے کہ فرائڈ کے دل و دماغ پر فلسفہ اور نفسیات کے اثرات سے زیادہ سیاسی حالات کا ارتسام تھا جس نے فرائڈ کو اپنے معرکۃ الآرا نظریوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا موقعہ دیا۔

اس عہد میں انسان کی ذہنی کشاکشیں اور اختلافات اس قدر وسیع ہوتے چلے جا رہے تھے کہ سنجوگ کا کہیں پتہ نظر نہیں آتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عہد میں ذہنی اختلافات کی اس قدر کثرت ہے کہ کوئی صلحنامہ و ارسائی کوئی معاہدہ، میثاق یا منشور او قیانوس یا نیا نظم عالم دیرپا امن اور ترقی کی ضمانت دینے سے قاصر ہے۔ فرائڈ نے بتلایا کہ جب کبھی تمام حرکتیں غیر شعوری سے شعوری بنتی جاتی ہیں تو ہمیں وہ نفسیاتی وجوہات دریافت کرنی چاہئیں کہ ہماری غیر شعوری حرکتوں کا محور بدل جائے۔ فرائڈ کا یہ نظریہ عصری بربادیوں کی بیخ کنی کا ایک موثر اور کامیاب حل ہے۔ فرائڈ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے میلانات کا آپ جائزہ لے۔ اس کا مدعا یہی ہے کہ انسان اپنی ہستی میں آپ سمو کر اپنی چارہ سازی آپ کرے۔ اپنی دکھتی ہوئی رگوں کا علاج کرے۔ فرائڈ کی اس صداقت کا دنیا پر گہرا اثر ہو چلا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیب "تحلیل نفسی"

کی بنیادوں پر ہماری مجلسی زندگی کے سارے مسائل حل کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی مجنون گورکھپوری، نیاز، کرشن چندر اور صلاح الدین احمد جیسے ادیب ہماری زندگی کے تمام اونچ نیچ کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھ کر پیش کر رہے ہیں۔ یورپ کی ادبیات پر فرائڈ کا اتنا گہرا اثر ہو چلا ہے۔ اور بالخصوص نوجوان لکھنے والے اس قدر متاثر ہوگئے ہیں کہ وہ سب اسی نئے زاویے سے ہر مسئلہ کی چھان بین کر رہے ہیں۔ فرائڈ کی تعلیمات کا اثر یورپ کے مفکرین پر بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس بحرانی دور میں یہ ناممکن ہے کہ تحلیل نفسی کی بنیادوں پر اس خونین معرکہ کا انجام عمل پذیر ہو جائے۔

فرائڈ نے انسانی ذہن کے تین محرکات تبلائے ہیں، جنھیں (Id) اڈ، اگو ego اور سوپر اگو Superego کہا جاتا ہے۔ اڈ کے متعلق فرائڈ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ خیالات اور خواہشات کا وہ مجموعہ ہے جو ہمیشہ موقع اور محل کا لحاظ کئے بغیر شعوری مظاہرہ کر بیٹھنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہمیں روزانہ ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ انسان بلا سوچے سمجھے غیر دانشمندانہ حرکات کا مرتکب ہو جاتا ہے اور بعد میں ندامت کا سہارا لیتا ہے۔ اڈ کا محور لذت اور مسرت کے اکتساب کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اسی لئے اڈ اکثر جنسی یا لذتی محرکات پیدا کرتا رہتا ہے۔ لیکن ہم بہت ساری حرکتیں عزیز و اقارب یا مجلسی زندگی کے احترام کی وجہ سے نہیں کر سکتے اس لئے اڈ میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور اسی حالت اعتدال کو اگو (ego) کہا جاتا ہے بعض مرتبہ ہم والدین یا بزرگوں کے وجود کو قطع نظر کرتے ہوئے بھی اکتساب لذت کے مائل رہتے ہیں لیکن ایسے مواقعوں پر والدین یا بزرگوں کا جبر و تشدد یا انکا اقتدار ہمیں روکے رکھتا ہے۔ اس اقتدار اور حاکمانہ اثر جو ہماری شعوری حرکتوں کی راہ میں مزاحم ہے سوپر اگو کہا جاتا ہے۔ فرائڈ کے اس عظیم الشان علم کی تصدیق ہماری روزمرہ زندگی اور ہمارے احساسات سے ہوتی ہے فرائڈ نے خواب کے متعلق علم تجزیۂ نفس کو اس قدر کامیاب بنایا ہے کہ اس نے تقریباً صد فیصد خوابوں کی صحیح صحیح تعبیریں پیش کی ہیں۔

فرائڈ کے نزدیک ذہنی شعور دو قسموں میں ہیں جنھیں حیاتی شعور اور تخریبی شعور کہا جاتا ہے۔ فرائڈ نے شہوانی شعور کو بھی حیاتی شعور میں شریک کیا ہے۔ اس کے نزدیک شہوانی شعور سے صرف عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی نہیں بلکہ محبت بھی ہے۔ خواہ یہ محبت اپنے خاندان کے کسی مرد سے ہو یا اجنبی سے ہو یا اپنے آپ سے ہو فرائڈ کا یہ معرکتہ الآرا کلیہ جب دنیا کے سامنے پیش ہوا کہ بچے جوان اور بوڑھے ان سب کی شعوری حرکات کا محرک ان کا شہوانی شعور رہتا ہے تو مذہب اور اخلاق کے ٹھیکہ داروں نے ایک شور مچایا کہ پھر دوسرا سقراط دنیا میں پیدا ہوا ہے جو نوجوانوں کے اخلاق کی تخریب اور انسانیت کی بیخ کنی چاہتا ہے۔ فرائڈ کو انتہائی مایوسیوں اور مجبوریوں کے عالم سے گذر کر کامیاب ہونا پڑا۔ فرائڈ اپنے دعوی کی دلیل میں کہتا ہے کہ ملا، واعظ، خطیب یہ رہبانیت کے امام، مندر کے مہنت اور ممبر کے خطیب اور یہ سارے سماجی اور سیاسی کارکن اور مصلح طوائف کو قابل نفرت اور قابل مقاطعہ قرار دیتے ہیں لیکن وہ اس ناپاک عنصر کو دنیا سے خارج کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس کا اپنا محکم ایقان یہ ہے کہ " یہ رہیگی۔ اس کا استیصال ناممکن ہے۔ ان پر نگرانی رکھنا بھی ناممکن ہے۔ چونکہ ہماری سماج میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو ان عورتوں کا محتاج ہے۔ اسی لئے نہ قانون اور نہ پولیس اتنی سکت رکھتے ہیں کہ اس کو دفع کیا جاسکے یہ پیدا ہوتی رہے گی"۔

فرائڈ نے محبت کے بارے میں بھی دنیا کی قدیم ڈگر سے ہٹ کر اور پہلی بار ایک نیا ہی انداز پیش کیا ہے کہ " محبت والدین کی اولاد کے لئے ایک تمنا ہے۔ اور اولاد کی تمنا ہے والد بننے کے لئے "۔ فرائڈ نے ہماری جنسی زندگی کے بہت سارے خطرناک اور زہریلے ناسور ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں جن کی ٹیس ہم محسوس کرتے تھے جنھیں ہم دیکھتے تھے لیکن جن کا بیان کرنا ہمارے تئیں گناہ اور عذاب کے مرادف تھا۔ فرائڈ نے ایچ، جی، ویلز کے یہ الفاظ دنیا کے سامنے دہرائے کہ " The future of sex is the centre of the whole problem of the human future."

" انسانی مسائل کے کامیاب مستقبل کا انحصار ہماری جنسی زندگی کی بنیاد پر ہے"

یہ ایک واقعہ ہے کہ ہماری مجلسی زندگی کے بعض انتہائی میلے گوشے جنہیں صدیوں کی غلاظت ہے۔ ابھی تک اسی گندگی میں مبتلا ہیں، فرائڈ، اور ہیولاک ایلس وغیرہ کی مقتدر شخصیتیں ہی ہیں جنھوں نے سماجی گندگی کو جو ہماری زندگی کے لئے ایک جونک ہے دور کرنے کا عزم کیا ہے فرائڈ کی تعلیمات کا مدار ہمارا جنسی مسئلہ بھی ہے جو کہ ترمیم تنسیخ اور تصحیح کے تمام مدارج سے گذرنیکا خود متمنی ہے۔ اب ہر ملک میں ادیبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو رہی ہے جو فرائڈ کے بنائے ہوئے اصولوں پر کار فرما ہے۔ فرائڈ کے یہ داعیات ہیں کہ ہماری ہر شعوری حرکت میں ہمارا شہوانی احساس کار فرما رہتا ہے۔ اور ہماری شہوانی یا جنسی زندگی ابتریوں کا ایک پلندہ ہے۔ اسی لئے ان ابتریوں کی طرف موثر اقدام نہایت ضروری ہے۔ اس کا علم تجزیۂ نفسی بہت ساری حقیقتوں کو بے نقاب کرچکا ہے۔ ہندوستانی فلسفے اور ادب پر بھی فرائڈ کا گہرہ اثر ہوچکا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب کہ فرائڈ کی تحقیقات کے نتائج امریکہ کی دریافت سے زیادہ قیمتی اور صنعتی انقلاب کے نتائج سے زیادہ ممتاز ہوں۔

اس کے علاوہ "تجزیہ نفسی" نے بہت ساری بیماریوں کا کامیاب علاج بھی کیا ہے۔ اس موقعہ ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایک امریکی لڑکی ایک ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار تھی "اس کی ۴ سالہ ہجر اور ناکام تمنا زندگی نے اس کے اعصاب پر اس قدر سخت حملہ کیا تھا کہ وہ ہسٹریا اور مالیخولیہ کی ایک خطرناک مریض تھی۔ چار سال کے بعد اس کی زندگی میں ایک دن ایسا آیا کہ وہ ڈاکٹر سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اتفاق کہئے کہ شادی کے دن ہی جب دونوں ماہ عسل منانے نکلے، موٹر کے حادثہ سے ڈاکٹر کا انتقال ہوگیا اس سانحہ کے اس لڑکی کے اعصاب پر اتنا بڑا اثر پیدا کیا کہ وہ پاگل اور دیوانی ہوگئی اور دق کے آثار پیدا ہوچکے۔ ایک سال کے بعد جب اسکے رشتہ داروں نے فرائڈ کے سامنے پیش کیا ہے تو فرائڈ نے چھ ماہ میں اس کا کامیا علاج کیا ہے اب وہ نئی مقابلانہ زندگی گذار رہی ہے۔

فرائڈ دنیا کا ایک بہت عظیم تر مفکر مدبر اور فلسفی حکیم ہے۔ اس کی تعلیمات نے فکر او

عمل کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ ڈاکٹر ارنسٹ جونس جو فرائڈ اسکول ہی کا ایک ممتاز فلسفی ہے کہتا ہے کہ مستقبل کی ساری سیاست، معاشرت، آداب اور آئین اسی تجزیہ نفسی کی بنیاد پر استوار ہوں گے جب ہٹلر نے گذشتہ سالوں میں آسٹریا پر قبضہ کیا تو فرائڈ کو گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کی وجہ اُس کا صیہونی ہونا ہے ہٹلر نے بڑے بڑے صیہونی زعما آئن اسٹائن، برگسان پال متی وغیرہ کیساتھ جو ناروا سلوک کیا ہے اس کا تختہ مشق فرائڈ بھی بنا ہے۔ وہاں کے بعد وہ لندن چلا آیا اور جلا وطنی میں ڈیڑھ سال گذار کر ستمبر ۱۹۳۹ء میں دنیا سے چلا گیا۔ فرائڈ آج نہیں ہے لیکن اس کی تعلیمات اس کا دبستان خیالات، اس کے وجدانات اور احساسات زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے فقط

.... میر عابد علیخان

بی اے۔ (آخری)

"توہم پرست سے"

وجودِ خارجی مجھ سے جدا خود اک حقیقت ہے — سوا ہے مجھ سے ہر شئے جو خیال حس کی علت ہے
مرے احساس خارج ہی سے تخلیق تخیل ہے — اسی احساس پر قائم تمیز سنبل و گل ہے
زمین و آسماں میرا توہم ہو نہیں سکتے — محض وہم و گماں یہ ماہ و انجم ہو نہیں سکتے
یہ دہوکہ ہے کہ خارج کو خیال خام سمجھا ہے — اس عالم کو کسی کی جلوہ گاہِ عام سمجھا ہے
یہ ذوق شغل تعبیر زمین و آسمان کب تک — غلط تفسیر کے گھائل رہیں یہ جسم و جاں کب تک
وجود مادیّت سے ہے سوزاں شمع عقلیّت — اسی کے نور سے روشن ہے راہ سرّ اصلیّت
شعور داخلی گر خالق کون و مکاں ہوتا — مرے نشا پہ ہی مبنی وجودِ دو جہاں ہوتا
مرے ہست و عدم پر گر جہاں مقسوم ہو جاتا — میں کیا معدوم ہوتا کل جہاں معدوم ہو جاتا
خرد کے نشتروں سے فاش کرڈے راز ہستی کے — جنوں کی موت کو رنگیں بنا تقدیر کے خوں سے
مرے فکر و عمل سے یوں مری تقدیر بنتی ہے — مصور کے ہنر سے جس طرح تصویر بنتی ہے

جنوں کا آسرا لیکر یہ دنیا چل نہیں سکتی
توہم کی فضا میں شمع ہستی جل نہیں سکتی

جمیل احمد فاروقی۔ بی۔ ایس سی (عثمانیہ)

روئداد سالانہ انجمن طلباء جامعہ عثمانیہ

بابتہ ۱۳۴۹-۵۰ ف

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم اپنی ذمہ داریوں سے لطمانیت قلب سبکدوش ہو رہے ہیں، جو عثمانین کے خدمت گذار ہونے کی حیثیت سے ہم پر گذشتہ سال عائد ہوئی تھیں۔ زیادہ صحیح ہوگا اگر ہم انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کو طلباء برادری کی اجتماعی زندگی، علمی اور عملی سرگرمیوں کا واحد مرکز کہیں۔

اس ادارہ کا حقیقی مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ وہ طلباء برادری میں اتحاد وارتباط پیدا کرے۔ انجمن اتحاد کا بنیادی مقصد بجز طلباء کی اجتماعی فکر کی ہم آہنگی کے اور کچھ نہیں۔

ہم نے ۱۰ بہمن ۱۳۵۰ ف کو جائزہ حاصل کیا تھا۔ دستور کی رو سے انجمن کے انتخابات پہلی میقات ہی میں ہو جانے چاہئے تھے لیکن غیر متوقع واقعات اور ناخوشگوار حادثات کی وجہ نہ صرف ہمارے انتخابات بلکہ ہماری تعلیم بھی کچھ دنوں تک معرض التواء میں پڑی رہی لیکن ان سے کم از کم ہمارے قدیم روایات کی تجدید ہوگئی کہ حضرت سلطان العلوم کے جان نثاروں کی یہ جماعت عزت نفس اور جامعہ کے وقار کی حفاظت میں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتی جائزہ کے دو تین ماہ بعد ہی مہاجر صاحب تحصیلداری کے لئے منتخب ہو کر جامعہ چھوڑ دئے اور صدارت کی تمام ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہوگئیں۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک بفضلہ میں محسوس کرتا ہوں

کہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔

برادران جامعہ۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے گذشتہ کابینہ سے جائزہ حاصل کرتے ہوئے انجمن کے مقاصد کو پورا کرنے کا وعدہ لیا تھا اور اس کی تکمیل کے لئے اپنی پوری کوشش بھی صرف کر دی۔ اب ہم سال بھر کی کارگزاری کا ایک اجمالی خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں اسی سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس قلیل عرصہ میں باوجود اتنی دشواریوں کے ہم نے کیا کیا امور انجام دیئے

مجلس انتظامی | مجلس انتظامی عثمانین کی منتخبہ جماعت ہوتی ہے اس کی اہم ذمہ داریوں سے اب شائدہی وزارت بخوبی آگاہ ہوجائے گی۔ ہم نے گذشتہ سال مجلس انتظامی کے ۵ اجلسے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد کئے اور ہم میں سے ہر ایک نے مجلس کو کامیاب بنانے اور اسے ترقی دینے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔

انجمن کے جلسوں کی تعداد | مجلس انتظامی کے جلسے ۱۵۔ معمولی جلسے ۵۔ غیر معمولی جلسے ۱۔ کاروباری جلسے ۳۔ جملہ (۲۴) قدیم اور جدید طلبا رکا ایک مباحثہ بھی منعقد کیا گیا جس میں ممتاز برادران قدیم کے علاوہ حضرات اساتذہ نے بھی حصہ لیا۔ ان تمام دشواریوں اور مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو ہمارے سدراہ تھیں جلسوں کی یہ تعداد قابل نظر اندازی تو نہیں ہے۔

بیرونی مباحثے مقابلے | سال گذشتہ ہماری ایک مباحثی جماعت نظام کالج کے تقریری مقابلے میں حصہ لی۔ جناب آیت اللہ بیگ عارف صاحب نے انعام دوم حاصل کیا۔ ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں

مباحثی سیاحت | انجمن اتحاد کی دو مباحثی جماعتیں جو محمد عمر صاحب مہاجر ابوالخیر صاحب صدیقی عبد الرزاق خاں صاحب اور مسٹر اچ۔ ڈبلیو بٹ پر مشتمل تھیں علیگڈھ اور دہلی روانہ کی گئیں علیگڈھ کے مباحثی مقابلے کے ملتوی ہونے کی اطلاع ہمیں ایسے وقت وصول ہوئی جبکہ ہماری مباحثی جماعت روانہ ہو چکی تھی خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ کوشش ضائع نہیں گئی۔ دہلی کے بین الہند مباحثی مقابلے میں جناب محمد عمر صاحب مہاجر نے عثمانین کی علمی اور ادبی قابلیتوں کا سکہ بٹھا دیا۔

اور انعام اول حاصل کرکے اپنی روایتی کامیابیوں میں ایک اور درخشاں مثال کا اضافہ کیا۔ ہم مہاجر صاحب کی خدمت میں پر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی زرین خدمات کا بہ صمیم قلب اعتراف کرتے ہیں۔

موازنہ ہر سال نئی وزارت کو جو سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے وہ موازنہ کا مسئلہ ہے لیکن ہم یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ ہم نے اپنے زمانے میں اس کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس سلسلہ میں ہم پروفیسر وحید الرحمن صاحب خازن اعزازی انجمن اتحاد کے بیحد ممنون و مشکور ہیں کہ موصوف نے اپنے دیرینہ تجربے اور فراست سے ساری گتھیوں کو نہایت آسانی کے ساتھ سلجھادیا۔ ہم جناب خازن صاحب اعزازی کی خدمت میں اپنے گہرے جذبات تشکر و امتنان پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

فرد حساب انجمن اتحاد طلبا جامعہ عثمانیہ بابتہ سال تعلیمی ۱۳۴۹.۵۰ ف

آمدنی — اخراجات — باقی — کیفیت

ذرائع	رقم روپیہ	آنہ	پائی	ابواب	رقم روپیہ	آنہ	پائی	باقی	رقم روپیہ	آنہ	پائی
بچت سال گذشتہ	۳۰۲	۹	۹	انتظام دفتر	۶۹۹	۶	۰	از روئے موازنہ			
از دفتر جامعہ	۲۴۳۰	۷	۰	کتب خانہ	۲۴۳	۸	۶	متوقع آمدنی	۴۶۰۸	۸	۴
از کلیہ انجنیری	۴۵۳	۰	۰	کھیل	۲۴۵						
				متفرقات	۳۰۰	۰	۰	حقیقی آمدنی	۳۱۸۶	۰	۹
				صادر طباعت	۸۴	۱	۱۰	تفہیم طلب			
				مباحثی سیاحت	۲۶۶	۳	۳	از دفتر جامعہ	۱۴۲۲	۸	۰
				اخراجات اتفاقی	۵۸	۸	۹				
				ادائی مطالبات							
				سال گذشتہ	۲۹۹	۸	۵	روپیہ آنہ پائی			
میزان آمدنی	۲۱۸۶	۰	۹	میزان خرچ	۲۲۹۶	۱۲	۹	۸۸۹.۴.۰۰			
				جملہ بجت بشمول رقم تفہیم طلب	۲۳۱۱	۱۲	۰				

جس میں سے مبلغ آٹھ سو نواسی روپیہ چار آنہ خازن صاحب اعزازی کی تحویل میں موجود ہیں۔

جشن یوم جامعہ | عزیز بھائیو! ہمیں اس کا سخت افسوس ہے کہ اپنے زمانے میں انتخابات کی تعویق اور امتحانات کی قربت کی وجہ جشن یوم جامعہ منا نہ سکے طلباء کو امتحانات کی کامیابی عزیز ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر جشن یوم جامعہ کا منایا جانا یقیناً ان کے لئے مضرت رسان اور نقصان دہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آپ کے مفاد میں جشن کو آنے والی کابینہ کے لئے ملتوی کر دیا ہمیں قوی امید ہے کہ سال حال اس جشن کو جامعہ کے روایات کے کامل احترام کے ساتھ نہایت اعلیٰ پیمانے پر منایا جائیگا۔

جہاں جشن یوم جامعہ اور انجمن کی مختلف کارگزاریوں کا ذکر ہو رہا ہے یقیناً یہ رُوداد نامکمل ہوگی اگر ہم اس موقع پر عالیجناب معین امیر جامعہ کی عنایت کا ذکر نہ کریں۔ انجمن کے جملہ معاملات میں آپ کی گہری دلچسپی ہمارے لئے موجب ممنونیت اور باعث طمانیت رہی ہے۔

ہم پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کے بھی بے حد ممنون و مشکور ہیں کہ آپ حضرات کے بیش بہا مشوروں سے ہم وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہے ہیں۔

گھریلو کھیل | سال حال انجمن کی کارگزاریوں میں گھریلو کھیلوں کے انعامی مقابلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مقابلوں میں طلباء کی ایک کثیر تعداد نے حصہ لیا خواجہ غلام محمدؐ صاحب معتمد کھیل نے اپنے فرائض کو بہ احسن الوجوہ انجام دیا۔ اس سال کے ٹورنمنٹ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جامعہ کا ہر طالب علم بغیر کسی فیس کی ادائی کے شرکت کر سکتا تھا۔ ہم جناب خواجہ صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

کتب خانہ | جناب ابوتراب خلیل الدین صاحب کتب خانہ دار کی خوش سلیقگی نے انجمن کے کتب خانہ کو بہتر طریقے پر سنوارا ہے۔ گذشتہ سال کتب خانہ میں (۱۱۷) کتابوں کا اضافہ ہوا طلباء کے مطالعہ کے لئے انجمن کے دارالمطالعہ میں اردو انگریزی معیاری اخبارات و رسائل منگوائے گئے۔ سال حال کتب خانہ سے (۵۴۸) طلباء نے استفادہ کیا۔ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبہ اردو اور جناب عزیز احمد صاحب پروفیسر شعبہ انگریزی خاص طور پر ہمارے

شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ حضرات نے کتب خانہ کے لئے کتابوں کے انتخاب میں ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرمایا۔ امید ہے کہ آپ حضرات کی یہ علمی اعانت آئندہ بھی ہمارے شامل رہے گی

سفارشات برادران جامعہ! ایسے موقع پر جب کہ ہم اپنے فرائض وذمہ داریوں سے سبکدوش ہورہے ہیں اور جدید عہدہ دار نئی امنگوں اور بلند ارادوں کے ساتھ آپ کی خدمت گزاری کے لئے ہم سے جائزہ حاصل کررہے ہیں۔ ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ آپ کی اوران کی توجہ ان چند مسائل کی طرف منعطف کرائیں جو ہمارے آئندہ لائحہ عمل میں شریک کئے جانے کے قابل ہیں۔

مد محفوظ میں اولاً اس سلسلہ میں مد محفوظ کا ذکر کرونگا۔ ہر بڑے ادارے کے لئے ایک مد محفوظ کی ضرورت اہل علم وفکر کے اس اجتماع میں کسی مزید اظہار کی محتاج نہیں ہے اگر آنے والی کابینہ کفایت شعاری سے کام لے کر طلبار کے اس عظیم الشان ادارے کے مفاد میں زیادہ سے زیادہ رقم پس انداز کرنے کی سعی کرے تو ہمیں ہے کہ ہمارا یہ مد محفوظ آئندہ چند سالوں میں ایک شاندار ذخیرہ کی حیثیت سے طلبار کے ہر ضروری مفاد میں مناسب طریقے سے صرف کیا جاسکیگا سال حال لشمول تفہیم طلب رقوم ہم مبلغ دو ہزار تین سو گیارہ روپیہ بارہ آنہ چھوڑرہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس مد کی ابتدا نہایت شاندار پیمانے پر ہوسکتی ہے ہم ہر آنے والی کابینہ سے متوقع ہیں کہ ہر سال تعلیمی کے ختم پر انجمن کی جس قدر رقم بھی باقی رہ جائے وہ آئندہ کے موازنہ میں جمع کرنے کے بجائے مد محفوظ میں شریک کردی جائے۔ اور یہ رقم غیر مستطیع طلبا کی امداد اور برادران جامعہ کے علمی اور ادبی خدمات کے اجاگر کرنے میں موزوں ومناسب طریقے سے صرف کی جاسکتی ہے ہمیں اس کی توقع ہے کہ ہماری یہ جدید کابینہ اس ذخیرے میں اضافہ کرنے کی اور مختلف تدابیر پر غور وفکر کرے گی۔

جشن یوم جامعہ کے سلسلے میں اس قدر عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے ہماری توجہ جامعہ کے شایان شان علمی مشاغل سے ہٹکر معمولی قسم کے تفریحی مشاغل کی

کی طرف زیادہ مبذول ہوگئی ہے۔ فی الحقیقت جشن یوم جامعہ ان اعلیٰ ترین محرکات کی یادگار ہے جو جامعہ عثمانیہ کے قیام کا باعث ہے۔ ہم اس جشن کے ذریعہ نہ صرف حضرت سلطان العلوم کی علم پروری اور معارف نوازی کے لئے نوجوان نسل کی جانب سے اپنی مسرتوں اور انبساط کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ہر سال اس جشن کے ذریعہ اس نصب العین کو اپنے آپ سے وابستہ کرلیتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ جیسے عظیم الشان علمی ادارے کی صورت میں آج دنیا کے سامنے موجود ہے۔ ایسا مبارک جشن ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جامعہ کے نصب العین سے ہٹ کر ہم اداکاری وغیرہ کی غیر علمی مصروفیات میں اپنا عزیز وقت اور روپیہ ضائع کریں۔ بین الجامعاتی مباحثے۔ طلبار کانفرنس۔ مشاعرے۔ علمی و ادبی محفلیں اور اسپورٹس مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ ہمارے جشن یوم جامعہ کا جز رہیں گے۔

یونیفارم | جامعہ کے یونیفارم کے متعلق عام طور پر عجیب وغریب بدگمانی ہے کہ ہر نیلی شیروانی یا کوٹ پہننے والے کو عثمانی سمجھا جاتا ہے اور اس کی تمام غلطیوں کو عثمانین سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے سد باب کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ جدید کابینہ اپنی پہلی فرصت میں جامعہ کے مانوگرام کے بیاجیس تیار کرانے کا انتظام کرے جو یونیفارم پر لگائے جاسکیں گے یہ ایک ایسی خصوصیت ہوگی جو عثمانین کو دوسروں سے ممیز کردے گی۔

مجلہ عثمانیہ | جس طرح انجمن اتحاد کا پلیٹ فارم طلبار کی تقریری قابلیتوں کا مظہر بنا رہتا ہے اسی طرح مجلہ عثمانیہ ان کی تحریری صلاحیتوں کا آئینہ وار ہے مجلس ادارت کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ طلبا مجلہ کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں جسکی وجہ سے مجلہ کی اشاعتوں میں تاخیر ہوتی ہے ہمیں توقع ہے کہ برادران جامعہ پورے انہماک سے مجلس ادارت کے ساتھ تعاون عمل کریں گے تاکہ مجلہ وقت پر شائع ہو اور اس کے معیار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔

توسیع اشاعت مجلہ | مجلہ کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں ہم عالی جناب نائب معین امیر جامعہ کی توجہ آنریبل معین امیر جامعہ کے اس وعدہ کی طرف منعطف کراتے ہیں جو آپ نے سررشتہ

تعلیمات کو احکام جاری کرنے کی نسبت فرمایا تھا۔ آپ کی ذرا سی توجہ ہماری اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کر دے گی۔

تعمیر عمارت انجمن اتحاد اور مجلہ کے دفاتر کے لئے تعمیر عمارت کے سلسلے میں ہم جناب والا کی کسی امید افزا اطلاع کے لئے بے چینی سے منتظر ہیں۔

موازنہ مجلہ عثمانیہ طلباء کی عام خواہش ہے کہ انجمن اتحاد کے موازنہ کی طرح مجلہ عثمانیہ کا موازنہ بھی طلباء کے اطلاع کے لئے جلسہ عام میں پیش کیا جائے مجلہ عثمانیہ طلباء ہی کا آرگن ہے اس لئے ان کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ تاکہ اراکین انجمن مجلہ کی آمد و خرچ سے مطلع رہیں اور بوقت ضرورت اظہار رائے کر سکیں۔ امید ہے کہ جناب والا اس پر بطور خاص غور فرمائیں گے۔

انجمن کے جلسوں کے اوقات امسال انجمن کے جلسوں کے اوقات ساڑھے تین بجے سے کر دئے گئے ہیں جس کی وجہ جلسوں کے شرکاء کی تعداد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہم عالیجناب نائب معین امیر جامعہ سے متوقع ہیں کہ وہ اس جانب بھی توجہ فرمائیں گے اور انجمن کے لئے کوئی مناسب وقت درسوں کے اوقات کے درمیان مقرر فرمائیں گے تاکہ ان علمی اجتماعات میں علاوہ مقیمین کے غیر مقیم طلباء بھی بآسانی شرکت کر سکیں ہم اپنی اس سالانہ روئداد کو اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ و شہزادگان والاشان و شہزادیان فرخندہ فال کی سلامتی اور ترقی عمر و اقبال کی دعا پر ختم کرتے ہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

عبدالرزاق نائب صدر

غزل

ہر نگہ پر تری بیتاب ہوا جاتا ہوں — صورتِ ماہی بے آب ہوا جاتا ہوں

میرے افسانے فراموش ہوئے جاتے ہیں — ہمنشینوں کے لئے خواب ہوا جاتا ہوں

دل میں اخلاص محبت میں صداقت رکھ کر — باعثِ رنجش احباب ہوا جاتا ہوں

اے ستم کیا کہوں کیفیتِ چشم ساقی
میں تو اس جام سے سیراب ہوا جاتا ہوں

کرشن دیال ستم

غزل

خوابوں کی سہانی بستی کا آنکھوں میں بسانا مشکل ہے — یہ راہ محبت ہے اے دل! منزل کا پانا مشکل ہے

یہ طرز تغافل، شرم وحیا، جی! اک دل کا قصہ ہی کیا — ان نیچی نظروں کے قرباں کیا آنکھ اٹھانا مشکل ہے

کیا عشق کو نسبت راحت سے روتے ہیں ہم تو غم کو بھی — یاں لب پہ تبسم کیا کھیلے آنسو بھی بہانا مشکل ہے

وارفتۂ الفت کیا سمجھے اس عقل وجنوں کے بندھن کو — دیوانہ بننا آسان تھا، اب ہوش میں آنا مشکل ہے

تاروں میں کہاں وہ دل کی ضیا؟ پھولوں میں کہاں وہ خندۂ غم؟ — جو داغ ہیں میرے سینے میں گل ایسے کھلانا مشکل ہے

کس عالم میں وہ رہتا ہے؟ تم راز کی باتیں کیا جانو!
شب روتے روتے بیت گئی اب دن کا آنا مشکل ہے

محمد شمس الدین انصاری راز بی۔ اے (آخری)

خطبہ صدارت جناب محمد علی نیّر

منتخب صدر بزم اردو جامعہ عثمانیہ

جلسۂ کرسی نشینی بزم اردو منعقدہ ۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کے موقع پر عالیجناب پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ کی صدارت میں بزم اردو کے منتخب صدر جناب محمد علی نیّر بی اے (آخری) نے پڑھا اس میں اردو زبان کے آغاز اور دیگر مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (مدیر)۔

عالیجناب نائب معین امیر جامعہ و معزز حاضرین!

میں اپنے محترم برادران جامعہ کی اس عزت افزائی کو درخور تشکر و امتنان سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مجھے بزم اردو کا صدر منتخب فرما کر مادر جامعہ کی خدمت گزاری کا موقع بہم پہنچایا۔ مجھے اپنے مرتبہ لائحہ عمل کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اردو زبان سے متعلق بعض ضروری امور کا تذکرہ کرنے کی اجازت دیجئے۔

حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ

حضرات! آج سلطنت حیدرآباد میں علمی و تمدنی ارتقاء، معاشی و معاشرتی اصلاح، اور صنعتی و زرعی تنظیم کے جو جلوے نظر آرہے ہیں اُن کی شہرت کائنات کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہے۔ حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ فی الحقیقت حضرت اقدس و اعلیٰ کے فیضانِ رہنمائی کی مرہون منت ہے۔ شاہ ذیجاہ کے تدبر و فراست اور

دانائی و عظمت کے نقوش مشاہیر عالم کے قلوب پر مرتسم ہوچکے ہیں۔

جامعۂ عثمانیہ کا قیام سلطان العلوم کا بلاشبہ ایک عہد آفرین کارنامہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ اسلامی اور مشرقی ثقافت کا ایک اہم بالشان سنگم ہے، جو بجا طور پر ہند جدید کی تعلیمی اور ثقافتی تاریخ میں ایک نشانِ منزل سمجھی جاتی ہے۔ ہماری جامعہ میں اردو زبان کو درس و تدریس کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اور ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طلبا میں تفکر و تخلیق کے سرچشمے اس وقت تک نہیں پھوٹتے، فکر و نظر میں وسعت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، ذہنی اور اپج صلاحیتیں اس وقت تک کامل نشو و نما حاصل نہیں کرسکتیں، تاوقتیکہ مادری زبان تعلیمی زبان قرار نہ دی جائے۔ جامعۂ عثمانیہ نے مادری زبان کو تعلیمی زبان قرار دے کر ایک دلیرانہ اقدام کیا ہے۔ جامعہ کا یہ اقدام جلالتہ الملک کی مجتہدانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے، جو دنیا کے بہترین مفکرین اور مصلحین سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے

سلطان العلوم اردو کے محسن اعظم ہیں

حضرات! اردو ایک وسعت پذیر زبان ہے۔ اس ہمہ گیر ہندوستانی نژاد زبان میں پنجابی، برج بھاشا، گجراتی، پوربی، مرہٹی، دراوڑی، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے عناصر شامل ہیں۔ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدہا سالہ اتحاد و ارتباط کی قابل قدر یادگار ہے۔

دکن اردو نظم و نثر کا مرز بوم ہے۔ حیدرآباد گزشتہ چار سو سال کے طویل عرصہ سے اردو کی ہمہ جہتی خدمت کررہا ہے۔ حیدرآباد میں شاہان گولکنڈہ کی معارف پروری کی بدولت متعدد صاحب عظمت انشاپرداز اور باکمال شعرا پیدا ہوئے حقیقت یہ ہے کہ اہل دکن نے ہر زمانہ میں اردو کی خدمت کا مقدس فریضہ کماحقہ ادا کیا۔ اُن کے کارناموں سے اُردو کا خزانہ مالامال ہے۔

حضرت اقدس و اعلیٰ نے جامعۂ عثمانیہ کی بہ نفس نفیس بنیاد ڈال کر اردو زبان کو حیاتِ ابدی بخش دی ہے آج ہندوستان میں حیدرآباد اردو کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے اور

سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ اردو کے محسن اعظم ہیں جلالت الملک کی علمی سرپرستی کے باعث حیدرآباد اپنی سطوت رفتہ اور دیرینہ عظمت حاصل کر چکا ہے۔ عہد عثمانی میں حیدرآباد نے اردو کی جو مہتم بالشان خدمت انجام دی ہے اُس کا مقابلہ ہندوستان کا کوئی خطہ نہیں کر سکتا۔

حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے علاوہ بعض غیر سرکاری ادارے مثلاً ادارۂ ادبیات اردو، لطف الدولہ ریسرچ سوسائٹی، حیدرآباد اکیڈیمی، شاخ انجمن ترقی اردو ہند، دارالاشاعت سیاسیہ، عبدالحق اکیڈیمی، اور عثمانیہ لٹریری اکیڈیمی وغیرہ بھی اردو زبان کی خدمت میں حتی الوسع سرگرم عمل ہیں۔ بالخصوص ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا سب سے بڑا غیر سرکاری مرکز ادب ہے جو محترمی ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی مدبرانہ رہنمائی میں اردو زبان کی گراں بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارہ کی مطبوعات تمام اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین مذکورہ بالا ادارہ کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔

(باقی آئندہ)

ایک اندھے کا اپنے دوست سے استفسار!؟

روشنی کہتے کسے ہیں کچھ بتا اے ہم نشین!
کس قدر ضو کی کرن ہوتی ہے عشرت آفرین!!
کس قدر فرحت فزا ہوتا ہے حسنِ کائنات!
کیسا ہوتا ہے بتا سورج کا روئے تابدار!
آہ کیسا ہوتا ہے مہتاب کے رخ کا نکھار!!
کس کو کہتے ہیں بتا یہ جلوۂ حسنِ قمر!
چاندنی راتوں میں دنیا کیسی آتی ہے نظر!!
کیسا ہوتا ہے بتا ماہ مبیں کا پیرہن!
آہ کتنی دور ہے یہ ماہ و انجم کا وطن!!
کیسا ہوتا ہے بتا گردوں کے تاروں کا جمال!
کیسا آتا ہے نظر بادل کے ٹکڑوں میں ہلال!!
کیا اثر کرتی ہے دل پر آہ ساون کی گھٹا!
کیسی ہوتی ہے گھٹ کے مسکرانے کی ادا!!
کیسی ہوتی ہے بتا یہ عارضِ گُل کی چمک!
آہ، کیسی ہوتی ہے شبنم کے موتی کی دمک!!

کیسے ہوتے ہیں بتا تو کوہسار و سبزہ زار!
آہ، کیسے ہوتے ہیں یہ گنگناتے آبشار!!
کیسی ہوتی ہے بتا بزم جہاں کی آب و تاب!
آہ، کیسا ہوتا ہے زہرہ جبینوں کا شباب!!
ہم نشین ہے میرا سینہ آرزؤں کا مزار!
دیکھ سکتا کاش میں بھی باغ گیتی کی بہار!!
وائے قسمت، ایک ہیں میرے لئے یہ صبح و شام!
ہو نہیں سکتا میں لطفِ زندگی سے شاد کام!!

کاش، پڑھ سکتا میں نظروں سے کتابِ زندگی!
کاش، پی سکتا میں نظروں سے شرابِ زندگی!!

محمد علی نیّر۔ بی۔ اے۔ (آخری)
صدر بزم اردو جامعہ عثمانیہ

تنقید و تبصرے

گاؤں سدہار۔ ماہنامہ

چیف اڈیٹر۔ سید محمد نواب صاحب۔
اڈیٹر۔ محمد عبد القوی صاحب بی۔اے

از صدر دفتر جمعیتہ اتحاد امداد باہمی محدود حیدرآباد۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس قیمت نامعلوم۔

حیدرآباد میں دیہات سدھار کا مسئلہ نہایت ہی سرگرم ہے چنانچہ عوام کو مفید کام کی ترغیب دینے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اور شائد اسی لئے یہ نہ صرف ملک کی مختلف زبانوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ بلکہ عوام میں مفت بھی تقسیم کیا جارہا ہے۔

ریاست حیدرآباد میں دیہی تنظیم کے متعلق جو نمائشیں ہوتی رہتی ہیں انکی رپورٹیں اور صدارتی اڈریس و نیز دیگر ایسی چیزیں جو عوام کے مفاد کی خاطر کی جاتی رہیں اس میں موجود ہیں۔ اس سے ہمیں رہبری ہوتی ہے کہ ہر نفس کے لئے کس قدر سعی کی جارہی ہے۔ آئندہ ہمیں ملک کے مفاد کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

ہمارے خیال میں اس قسم کے رسالوں کی ملک کو سخت ضرورت ہے ہمیں امید ہے کہ اگر اسی طرح کام جاری رہے تو آئندہ ملک کی ترقی کے لئے اس رسالہ سے بہت مدد ملیگی۔

ش، م۔خ

نیا ادب کیا ہے

منجانب حلقہ ادب لکھنؤ۔
مدیر اس کے جوش ملیح آبادی (جنوری و فبروری ۱۹۴۱ء)

یہ رسالہ نیا ادب و کلیم کا خاص نمبر ہے۔ حالات زمانہ اس کے متقاضی ہیں کہ ہم

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ "صحیح ذوق ادب" کو بھی جانیں۔ فی زمانہ جو ادب اور تنقید کا تخیل ہمارے دلوں میں ہے اس کا دراصل ادب سے تعلق نہیں۔ ادب کے صحیح اصول کا خاکہ ان معلومات آفرین مضامین کو پڑھنے سے ہو سکتا ہے جو نئے ادب کے اس خصوصی شمارے میں درج ہیں۔ منشی پریم چند انجہانی مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ٹیگور انجہانی اور مجنون گورکھپوری کے مضامین بطور خاص پڑھنے کے قابل ہیں۔ عبدالحلیم صاحب کا مضمون ادبی تنقید کے بنیادی اصول کا انکشاف کرتا ہے جس کا ہر ادبی ذوق رکھنے والے شخص کو پڑھنا لازمی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری موجودہ ادبی تنقیدی نقطۂ نظر میں کافی وسعت پیدا ہو گی اور کارکنان حلقہ ادب کا یہ بصیرت افروز مجموعہ اہل ذوق کی نگاہوں میں قدر کے ساتھ دیکھا جائے گا۔ ک۔ د۔ س۔

دیر و حرم

از منظور احمد منظور :- ملنے کا پتہ۔ لاہور بک۔ شاپ لاہور۔
صفحات (۲۰۰) قیمت عہ مجلد عا

دیر و حرم منظور صاحب کا دیوان ہے۔ سب سے پہلے علامہ کیفی کا تعارف ہے۔ اور پھر محترمہ نجمہ تصدق صاحبہ نے منظور صاحب کے کلام پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ان میں ۴ منظوم افسانے ہیں۔ افسانوں کا اسلوب بیان نہایت شیریں ہے جن میں سوشل مفاد پنہاں رکھا گیا ہے۔

کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر "پیدائشی شاعر" ہے جس میں رومانیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ زبان کی سلاست، نیرنگیٔ خیال، تخیل کی گہرائی، شاعر کی ہمہ گونہ خصوصیات میں سے چند ایک ہیں۔ سابقہ تصنع جو متاخرین کے کلام کا ایک اہم جز خیال کیا جاتا ہے اور فی زمانہ ایسے خیالات "دیرینہ خیالات" سمجھے جاتے ہیں، شاعر کے کلام میں عنقا ہیں۔ دقیق اور سخت الفاظ سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے اور سلاست و احساسات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ش۔ م۔ خ۔

کلیہ کی خبریں

امیر جامعہ کا ورود اس سال میقات اوّل کے اواخر میں نواب صاحب چھتاری نے بحیثیت امیر جامعہ دارالتقاریر میں طلباء کے ایک کثیر اجتماع کو مخاطب کیا نئے صدر اعظم اور نئے امیر جامعہ کے لئے عثمانی برادری جس پر جوش استقبال کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اور نواب صاحب نے طلباء کو مخاطب فرما کر جو حقیقت افروز پیام دیا وہ بھی اپنی اہمیت کی وجہ سے ناقابل فراموش ہے آپ نے فرمایا کہ جامعہ عثمانیہ اعلیحضرت حضور پر نور کا وہ یادگار کارنامہ ہے جس کی عظمت کسی شرح وبیان کی محتاج نہیں۔ یہاں نہ صرف علوم کو آزادی نصیب ہوتی ہے بلکہ خیالات اور اعتقادات کے دروازے بھی رعایا پر کھول دیئے گئے ہیں کلیہ فنون کی عمارت ہند و مسلم آرٹ کا ایک حسین اشتراک ہے اور ہند و مسلم طلباء کا اتحاد ایک ایسا امید افزا ارتباط ہے جو مستقبل کے درخشانیوں کو قریب تر کر دیا ہے اردو زبان کی اہمیت، دکن کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب معزز نے طلباء جامعہ کی علمی کوششوں پر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

ملک دکن کے لئے نواب صاحب کی خدمات باعث افتخار ہیں ہمیں امید ہے کہ جامعہ نواب صاحب کی پرخلوص رہنمائیوں سے مستفید ہوتی رہے گی۔

انتخابات انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کے سالانہ انتخابات ۵۰-۱۹۵۱ف میقات اول میں عمل میں آئے۔ عاقل علی خانصاحب متعلم ام اے آخری سید عبدالرشید صاحب قریشی متعلم بی اے (آخری)

اور زکریا علی خاں صاحب متعلم ایل۔ایل۔بی۔(آخری) صدارت کے امیدوار تھے۔ نتائج انتخابات حسب ذیل ہیں۔

صدر۔ عاقل علی خانصاحب۔ بی۔ اے۔

نائب صدر۔ مرزا سیف علی بیگ صاحب۔ بی۔ ایس۔ سی۔

معتمد ابو تراب خلیل الدین صاحب۔ بی۔ ایس۔ سی۔

کتب خانہ دار۔ حامد محی الدین صاحب۔ متعلم۔ بی۔ اے۔

نمائندگان۔

شعبہ قانون۔ محمد عبدالستار صاحب ایل۔ایل۔ بی۔(آخری)

شعبہ دینیات۔ رکن الدین صاحب۔ بی۔ اے (ر)

شعبہ انجنیرنگ۔ جعفر محی الدین صاحب۔

ر ر امجد علی خانصاحب۔

شعبہ فنون۔ سید علی محمد صاحب۔ متعلم ام۔اے (ابتدائی)

ر ر عبدالعزیز صاحب ر ر ر

ر ر یسین خان صاحب متعلم۔ بی۔اے۔(آخری) ر

شعبہ سائنس۔ حامد معین الدین صاحب متعلم۔ ام۔ ایس۔ سی۔

ر ر مسٹر دیشپانڈے۔ ر ر

ر ر مسٹر ملک ارجن پٹیل۔ متعلم بی۔ ایس۔ سی (آخری)

ہم اس کابینہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ان توقعات کو عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ جو انتخابات سے پہلے گنائے جاتے تھے۔ جو واقعات کہ گذر چکے۔ اور جن کا احساس عام ہے انھیں ہم یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ ساتھ ہی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جامعہ کا مفاد جو جملہ عثمانین کا اولین نصب العین

ہونا چاہئے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سال حال اگر "انتخابی مخاصمت" کو جامعہ کے مفاد پر ترجیح نہ دیگئی تو یقیناً یہ ایک مہتم بالشان کارنامہ ہوگا۔ ایثار اور خدمت کے نقوش دلوں میں محفوظ رہتے ہیں وہ مٹائے نہیں مٹ سکتے۔

اگر عثمانی برادری پانی کے سر سے گذرنے کے بعد ہی فرض شناس اور شایان شان زندگی کی سانس لینے والی ہے تو بھی ہم اس وقت کے انتظار میں مایوسی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ ؎ نہیں مایوس ہے اقبال اپنی کشت ویراں سے ✤ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حیدرآباد سول سروس | حیدرآباد سول سروس کے گذشتہ ملتوی انتخابات اس سال عمل میں آئے ہمارے کلیہ کے دو طیلسانین مسٹر نور الحسن جعفری بی۔ ایس سی اور مسٹر سری کشن سنھابی۔ اے منتخب ہوئے۔ ہم ان کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

تقررات | جامعہ عثمانیہ کے قدیم اور موجودہ طلباء کے لئے یہ امر نہ صرف باعث مسرت ہے بلکہ باعث افتخار بھی کہ سال حال جامعہ کی زندگی میں پہلی بار اسکے ایک ہونہار اور قابل ستائش سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کا شعبہ اردو کی صدارت پر تقرر عمل میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جامعہ کے ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جن پر حیدرآباد جامعہ اور اس کے فرزند ہمیشہ فخر کرتے رہینگے۔ اس سے پیشتر جامعہ عثمانیہ میں جامعہ کے طیلسانین زیادہ سے زیادہ پروفیسر ہوتے رہے ہیں لیکن الحمد للہ ڈاکٹر صاحب کا تقرر شعبہ اردو کی صدارت پر پہلی مرتبہ عمل میں آیا اس موقع پر ہم عثمانیہ برادری کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مخلصانہ اور عقیدت مندانہ ہدیہ تبریک پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب موصوف کی اعلیٰ قابلیتوں اور دیرینہ تجربہ سے توقع ہے کہ شعبۂ اردو آپ کی رہنمائی میں دن دونی، رات چوگنی ترقی کرے گا ہمیں بے انتہا مسرت ہے کہ مولوی قاری قطب الدین صاحب ریڈر شعبۂ دینیات کا تقرر نائب نظامت محکمۂ دیوانی وملکی ومال پر عمل میں آیا۔ مولوی صاحب موصوف ہماری ہی جامعہ کے ایک ممتاز برادر قدیم ہیں۔ آپ کے اعزاز میں بزم دینیات کی جانب سے ایک پر تکلف عصرانہ دارالتقاریر میں

ترتیب دیا گیا تھا جس میں عالیجناب نائب معین امیر جامعہ و مولٰنا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات اور مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفری بی۔ اے (عثمانیہ)۔ نے تقریریں کیں۔ آخر میں قاری صاحب موصوف نے اپنی جوابی تقریر میں جامعہ اور برادران جامعہ بالخصوص شعبہ دینیات سے اپنی گہری اور نہ مٹنے والے خلوص و محبت کا اظہار فرمایا۔

ہم قاری صاحب موصوف کی خدمت میں مخلصانہ ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

حلقۂ اساتذہ میں فارغ التحصیل برادران جامعہ کا اضافہ ہمارے لئے باعث مسرت ہے۔ اس قدردانی کے لئے ہم ارباب جامعہ کے مشکور ہیں۔

شعبہ نباتیات میں فتح نصیب خانصاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ اور شعبہ حیوانیات میں محمد عمر خانصاحب ام ایس سی اور شیخ عبدالوہاب صاحب ایم ایس سی۔ کے تقررات عمل میں آئے ہم ان تینوں برادران جامعہ کو مبارکباد دیتے ہیں اور قوی توقع ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں سے مادر جامعہ کی خدمت بوجوہ احسن انجام دینگے۔

کلیہ کی ذیلی انجمنیں

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ امسال بعض مردہ اور نیم مردہ انجمنوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور ایک نئے جوش کے ساتھ انتخابی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا۔ ان میں قابل الذکر بزم فلسفہ اور بزم اردو ہیں۔

بزم فلسفہ:۔ ایک مدت مدید کی کس مپرسی کے بعد دور احیاء سے گذر رہی ہے اور اس بزم کے انتخابات پوری دلچسپی اور انہاک کا مظہر بنے رہے بزم کی یہ بیداری شعبہ فلسفہ کے لئے فال نیک ہے۔ اور جناب اکبر علیصاحب ناصری متعلم بی۔ اے (آخری)۔ کا صدارت کے لئے انتخاب اس کی عملی زندگی کے آثار کو یقینی بنا دیتا ہے۔ ہم جناب صدر اور منتخب معتمد مسٹر عابد علی خاں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے شرکا کار کی معاونت سے بزم میں جوش عمل کی روح کو کارفرما کر دیں گے۔ اور بزم کا یہ سال اپنی گوناگون کاروائیوں کی وجہ سے ایک یادگار اہمیت کا مالک بن جائے گا۔

بزم اُردو ۔ اسی سال بزم اردو کا احیاء بھی عمل میں آیا ہے۔ نئے انتخابات میں

میں محمد علی صاحب نیر متعلم بی۔اے (آخری) صدر اور سید محمد یوسف صاحب ناظم معتمد منتخب ہوگئے ہیں۔ بزم کا جلسہ کرسی نشینی زیر صدارت نائب معین امیر جامعہ منعقد ہوا۔ مسٹر محمد علی نیر نے اپنے محققانہ اور پر از معلومات خطبۂ صدارت میں اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء پر روشنی ڈالی۔ عالیجناب نائب معین امیر جامعہ کی بصیرت افروز صدارتی تقریر کے بعد جلسہ اختتام کو پہنچا۔

بزم قانون:۔ بزم قانون میں نئے عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا جلسہ کرسی نشینی زیر صدارت آنریبل سید عبد العزیز صاحب صدر المہام عدالت اور امور مذہبی منعقد ہوا۔ منتخب صدر ریاض احمد صاحب متعلم ایل۔ایل۔بی۔ (آخری)۔ نے اپنے خطبۂ صدارت میں طلبا، قانون کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مفید تحریکات پیش کیں ہم عالیجناب صدر المہام بہادر کے بدل مشکور ہیں کہ انھوں نے حسب ذیل تحریکات منظور فرمائیں۔

۱۔ جامعہ عثمانیہ کے طیلسانین قانون کے لئے صداقت نامہ اردو دانی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

۲۔ محکمۂ عدالت میں غیر قانون داں شخص کا تقرر نہ ہوگا۔

امتیازی کامیابی جامعہ کے مختلف امتحانات میں حسب ذیل برادران کلیہ نے اس سال امتیازی کامیابی حاصل کی ہے ہم ان کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی (آخری)	ابوالخیر صدیقی صاحب اول
ایل۔ایل۔ بی۔ (ابتدائی)	محمد عبد الستار صاحب "
ایم۔ ایس۔سی	محمد عمر خانصاحب "
بی۔ ایس۔سی	شفقت حسین صاحب "

محمد خلیل الدین احمد خان
شریک مدیر

Born September, 25th 1755,
Died March, 25, 1798.
'Faithful unto Death'

R. I. P.

K. Clement-Jones.

Raymond was received in his own cantonment with a royal salute, his soldiers wore the cap of Liberty engraved on their buttons, and his regimental returns were headed "Corps Francois de Raymond.

Malleson speaks of him in the most eulogistic terms. He says: "No European of mark who followed him in India ever succeeded in gaining to such an extent, the love, the esteem and the admiration of the natives of the country."

Raymond's Tomb is an obelisk of black granite, 23 feet high, standing in the centre of a masonry platform 180 feet long and 80 feet wide. On the tomb are the simple initials "J. R." About 25 feet away is a flat-roofed building, supported by 28 pillars, forming a shrine similar to Grecian temple. On the pediment of the building is a carving of the Nizam's flag, surmounted by a cross.

On each anniversary of his death a large Urus or Fair was held when the tomb used to be illuminated, and salvoes were fired in his honour by the irregular troops, known as the Myseram Regiment. They wore the French Zouave, and marched up the hill singing their war songs to the accompaniment of reed instruments, somewhat like bagpipes.

A white cockeral would be taken to be offered as a sacrifice at the Temple and a bottle of Castillon Brandy would be shared by the chief men. A sum of Rs. 100 (about £ 18) was allotted by the Government towards the cost of the "Urus."

The inscription, which was, I believe, intended to be engraved on the tablet, facing the west, reads :—

Sacred to the memory of

General Michel Joachim Marie Raymond,

Comptroller of Ordnance, The Nizam's Army,

In 1778 Pondicherry was taken by the British and Raymond betook himself to Mysore, where he enrolled in the service of the Ruler, Hyder Ali Khan, the Tiger Chief.

On the death of Hyder Ali Khan in 1785, he joined Prince Basalat Jung, the brother of the Nizam. In 1786 he entered the service of His Highness Mir Nizan Ali Khan Bahadur, the second Nizam of Hyderabad.

Within a short time he had at his command 15,000 men divided into twenty battalions, under the command of 124 Europeans. Raymond had his troops in first rate fighting trim, but at the battle of Kurdla on the 9th March 1795, the Nizam's forces were defeated by the Mahrattas.

In the duel between Perron on the side of the Mahrattas, and Raymond on that of the Nizam, the latter was gaining on Perron's battalions, when the favourite lady of the harem, threatened to break her "gosha" (seclusion), if the Nizam, who was in the forefront of the army, did not instantly seek the shelter of the Fort. The Nizam, thereupon, ordered Raymond to retire, and to cover the retreat of the infantry, who were no match for the large forces of the Mahrattas.

A year after the battle of Kurdla the Nizam's Ordnance Department was placed under the expert guidance of Raymond, who was designated Amir-i-Jinsi or Comptroller of Ordnance. Such was the esteem in which Raymond was held by the Ruler that he bestowed on him the title of Azdhar Jung (The dragon-of-war), Azdhar-ud-Dowla (The dragon among nobles), Muthavar-ul-Mulk (The Bravest in the State) corresponding to the English titles of Knight, Lord and Earl respectively.

To maintain himself befitting his rank and position the Nizam granted him Jaghirs (lands held on Military tenure) yielding an annual revenue of Rs. 6,85,302 (£ 50,000).

JOACHIM RAYMOND; AN INTREPID ADVENTURER

Many adventurers have lived and died in Hyderabad, the Dominions of His Exalted Highness the Nizam, but few have left a more enduring name among the village folk than Monsieur Michel Joachim Marie Raymond or Francois Raymond, as he was popularly called.

To this day his name is remembered in remote parts of the Nizam's Dominions, and more particularly in the village of Sarurnagar, near Raymond's Mount (Moosa Rahm Takkedi), where he lies buried. The villagers love to recant stories of the man whose memory is fresh in the countless hearts of ,those, whose forefathers loved and honoured him as a hero.

Hyderabad, in the early days, seems to have been a dumping ground for adventurers of all nationalities, and even Government servants, who in the spacious days of the eighteenth century rendered conspicuous service to the State are remembered not so much for the institutions built by them, but for their affability, generosity and profound understanding of native customs, habits and thoughts.

Truly, nowhere is Carlyle's doctrine of hero-worship better illustrated than in India, for the history of the country is a history, not of institutions, but of men, the leaders, religious and secular of the people from age to age. Such for instance are the names of Meadows Taylor, Hastings Fraser, Achilles Kirkpatrick, William Palmer, Louis Finglas and Edward Lawrie.

Raymond was born in Gascony on the 25 September 1755, and like his father before him came out to Pondicherry in 1775, determined to establish a business in India, but in those troublous times, the son soon exchanged the pen for the sword.

falling,—falling through interstellar space into Eternity..... through a yawning fathomless abyss.....my head is swimming ......there is a death rattle in my throat.....I try to speak and choke.....Remember Ruki and Radhu.....

A mist is gathering before my eyes and through mist and fog I see a holy fire soaring towards heaven, And Lo! on the top of the highest flame I behold two sublime figures,—Radhu's curls aflamed with unearthly light and a heavenly radiance shining through Ruki's eyes— An angelic smile is playing on their lips—And they are beckoning me—calling me upwards—but I am falling, falling—O Ishwar".

"Don't you sit and gape at that dreary landscape," said Hassan as he gave me a hot cup of tea from the thermds flask, after waking me from my dream with not a too soft nudge in my ribs. "You had such a far off look in your eyes and the choking grunts that you uttered were so disquieting not to say pig-like that we were really alarmed. At one time you paled to ashen grey and as suddenly blood rushed to your face making it crimson red. You did change colour, my dear human chameleon. Your looks were most terrifying. You had the appearance of a person who is recovering from a dreadful dream or a hypnotic spell. For one dreaded moment we thought you had a touch of the sun but thank God it was nothing more than a mere touch of the moon. And we imagined that our pleasant picnic to the Golconda fort would end in a solemn march to the Osmania Hospital—with you stretched on a hurriedly constructed stretcher........."

FEROZ MEHTA.

It was a glorious morn and I grimly set myself to lead my brave men to death or glory. I chose a black charger, and after a hasty meal set forth at the head of grim soldiers bound to kill or be killed. With a fast beating heart I saw myself as follows:—

'I am charging a cavalry of very brave and fanatical Afghans, tall, strong, well-built and well-mounted with huge, flowing whiskers like us the Rajupts.....I do not care whom I charge.....we all rush, every man for himself, hell for leather at the most tremendous pace to which he can spur his horse.....My black horse is a demon reincarnate.....He is like the winged horses of Gods.....O Wings! spurn, spurn the dust 'neath thy fleet hoofs, stretch thy graceful neck, bear me gallantly today, O wings, for never shalt thou and I see its like again.....He knows that this is his last moment...... Swiftly we fly with the wind before and dust behind.....The Earth seems to tremble beneath the thunderous rush of heavy hoofs.....I am happy, wildly happy with not a thought to mar my joy.....I wave my sword and lustily shout for my companions to follow.....but they do not require words of encouragement.

We thunder on, an irresistible avalanche of men and horses, and, like a swimmer diving from a cliff into the sea— I am into the solid mass with a mighty crash.....I and my horse strike them like a single projectile. I am a battering ram, scattering my enemies like chaff—I cut and parry, slash, parry and cut, thrust and strike and rise in my stirrup and hack and hew—until I am through them like a knife through cheese and spurring again to gallop.......

Suddenly a big swarthy Afghan looms large before me, waving a huge scimitar—in the morning light the weapon makes a vicious circle of shinning silver and descends upon me.....it seems as if I am smitten by lightening—I am

instead of fleeing with my beloved ones to sure safety? Why was I here, with death a matter of hours—and why must I think and think and think of Love and Duty? and which to follow— Love or Duty. And suddenly I realized that as a true Rajput I must put the orders of my Raja, and, above all, the welfare of my country, before everything—and *everybody.* Duty—thou stern Goddess, thou hast won.

I remained thus for a long time, but I was at length aroused by a voice –a strangely sweet and gentle voice at no great distance, the voice of my conscience and my guardian Angel:

"Thou hast won, brave Rajput, and Chittore may well be proud of thee. Go and do thy duty—a greater power than thee shalt take care of thee and thine.

Knowest thou this, ye unbelieving creature that he who killeth and he who gets killed both drift onward down the river called Life. The river seeketh the sea, life seeketh continuity beyond every limit in perpetual reciprocity between the creator and his creation".

The soft caressing tone was balm to my ruffled feelings. A great calm descended upon my soul and I humbly resigned myself to the inevitable. Now as the inner voice spoke the Demon at my side appeared in his true colours. No longer the jovial companion, he was himself again, "horns, hoof and tail—nay, indeed he seemed a thousand times more foul and hideous than before, as he mouthed and jibbed at me in baffled fury, wherefore I smiled and turned my back upon him".

So the voice ended, and there was silence and profound stillness upon all things and in the calmness of my heart I knew that the demon had cast himself upon the ground, and was tearing the grass in a paroxysm of rage and bafflement; wherefore lifting my eyes unto the East, I saw that it was dawn. It was the dawn whose sunset I would never see.

and glory ? Bhimsing! Bhimsing! who is that, having the chance to live, prefers death ? Bhimsing! Bhimsing! who is the idiot that runs after the shadow and leaves the substance ? Bhimsing! Bhimsing! who is the madman that puts Duty before Love ? Bhimsing! Bhimsing! who is the fool ?......... who is the madman......Bhimsing! Bhimsing!"

Blood rushed to my brain. My brain was set on fire, I was stark mad as I faced the bleak prospect.

'Well, thou'rt dead — a small handful of grey dust — mingled with the ashes of thy son and wife—perchance even now it is not too late, you poor, blind, self-deluding fool,— O Fool Divine'.

The elements were in riot. The storm in my brain was at its height, and as I listened, the voices of good and evil became merged and blended into an awful music—a symphony of Life and Deat hplayed by the hands of God, and I was an atom, less than an atom, a moth on the beams of his Light, a twinkling light before His Mighty Glory—a grain of dust, a nonentity to be blown away into eternity by the puff of His Wind, scorched to death by a look of His Eyes, smitten down to pieces by a drizzle of His Rain and crushed beyond recognition by His Little Finger. And yet needs must this grain of dust still have an ideal to live and die for. And needs must this insect set up an altar in its heart where its soul might worship but occasionally his idol has feet of clay and often he sees his altar foully desecrated, shattered and utterly destroyed. But such is the nature of man that he needs must again enshrine his ideal in his heart and put back the idol on its pedestal. Just as a speck of dust dancing on a beam of sunlight reflects the glory of the sun so does man reflect Godhood.

Only the dead have peace. Or, not even they if memories linger in the hereafter.

Why ? Why ? Why ? Why was I on my way to death

"Love is greater than duty—you dog," chuckled the Demon. This demon was no devil with horns and hoofs but a witty, jovial companion. His pleasant face was wreathed in smiles as he with a wink and a sly nudge urged me to abandon the call of Duty.

"What is young life but to live", said he in my ear, "you are young and life is still gay with Ruki and Radhu. Why not try it, you blooming idiot. Jaipur shall welcome you with open arms and you will rise to great heights".

I tried not to heed his words. I knew I could not listen to this voice. But it persisted. It unceasingly rang in my ears. I could not bear it. With a last lingerning look on the beloved face and a fervent prayer on my lips I rushed out of my house.

On I went, scrambling through hedges and ditch with my eyes on the distant woods and my thoughts far, far away. On, and ever on, climbing steep uplands, plunging down precipitous slopes, past brawling brooks, and silent pools—on and on, lost to everything but my thoughts: And my thoughts were not of the pleasantest as I watched a Demon that ran beside me, leaping and gambolling at my elbow, though I kept my eyes straight before me. Anon, his clutching fingers were upon my arm, and fain I would have shaken him off, but could not; while a hammer was set a-beating in my brain.

So we traversed the alleys of the wood, now in shadow, now in moonlight, Demon and I, and never for a moment the voice at my ear stopped whispering, "Take thy chance, you dog and save thy child. Wilt thou sacrifice thy curly haired son for vain glory ?.

Round about me, in the dark, were imps that laughed and whispered together, and the loudest and coarsest was that of my jovial companion. Softly whispered the wind in the leaves, "who is the fool that runs away from his home to certain death

eyes as she turned her face away from me. All the while my Radhu was looking at us with his round wondering eyes, I felt my mouth become suddenly parched and dry, and the palms of my hands grew moist and clammy. There was a lump in my throat. I tried to speak but only a gutteral sound escaped my lips. Slowly I got up and gently stroked the black curls of my son. Ruki had not spoken a single word but I could read her as an open book. she was concerned about her child. So was I. In the dwindling light of the oil lamp we three stood, Ruki, Radhu, myself, facing one another with utter failure written large on our countenances. In a trice all my brave resolutions parted leaving me cold and clammy. Tears of rage and frustration welled up in my eyes. It was the first time in my life that I had shed tears since my childhood, but I was not ashamed of them.

With the despair of a cornered rat I thought furiously. Let me think..........Kind God let me think. If I could let the Afghans through the secret way they would give me a safe passage to Jaipur. But would it be consistent with my honour as a Rajput, a warrior and captain of the Maharana's forces. No. At that I drew the line. At first I was almost sick at the bare idea. My life for my kith and kin, but not my honour.... whence come these devilish thoughts into clear minds? I thrust the vile thought from me.

Work, poor brain, work! His life depends upon it........
Suddenly I was seized by an Evil spirit—-goading me towards evil. With the beautiful image of my son it urged me away from the right path. It bade me sell my honour and my beautiful country for the sake of my child. The idea was repelling in the extreme and yet...........

'Yes! why not? Don't you love your wife and child more than anything in the world? Is not their safety your duty as well? Then why not be a man and take a bid for safety," sneered the Devil.

the charge and meet death on the battle field with a certain beloved name on my lips. But what would she say? She was a true Rajput and I instinctively knew that she would answer me in the words of the great queen Sanjogan to her Lord Prithivi Raj, the King of Delhi:

> " We women are the lakes, you men
> are the swans, when are ye far away
> from the bosom...........
> To die well is to live for ever.
> Think not of your own self but of
> immortality, cut your enemy into two,
> and I shall be your other half hereafter.
> It is not the flames of the
> funeral pyre that purify the soul.
> But as the enigma is solved only thro'
> the one right word, so the heart is
> liberated out of Sansara's enchant-
> ment only by the other heart to which
> it belongs, here or hereafter on its
> way to God".

I felt proud as the mighty gods in heavens as these comforting thoughts glided through my mind. With a song in my heart I bent my way to my home. I was anxious to see a young bright face with soft worshipping eyes. Ah—there sat my brave Rukmini, cooking my last meals. With loving care she was making 'chapatis' for me.

'Ruki, won't you serve the dinner?' With a lingering smile on her coral lips she set a steaming dinner before me.

Rukmini always took her meals after ministering to my wants. This was the custom of our people.

Suddenly I looked at her. She was gazing wistfully at Radhu whom we both adored. There was a flash of tears in her

to love. But how weak, cowardly and dejected one feels when the dreaded moment of leave taking comes—when the stern Goddess of Duty demands its 'Pound of Flesh'. Duty is a jealous Goddess—it brooks no opposition, no half hearted devotion from its votaries. Everything must be sacrificed, everything must be put aside before the clarion call of duty. Even love is no barrier.

O Ishwar why hast thou not given us the strength and fortitude of Gods in heaven? Why hast thou given us warm hearts to feel, love, admire and call our own? Is this thy justice O Almighty One? Shall I leave my wife and son and tread the righteous path to the unknown Goal? Shall I sacrifice my name, my honour and all that is dear to a man and a soldier and listen to the call of Love? Death with mental anguish is bad but a love without honour is by far worse. In times of crisis, we, the Rajputs, put little value on our lives—these you may have whenever you want, but why these pangs of separation, the bitter-sweet good-byes. I know I shall meet soldier's death on the field of battle. But O Ishwar, let me die in peace. Thus in the fullness of my heart I prayed in the silence of the night and God in heaven looked on my prostrate body with infinite love and compassion.

As I prostrated myself, God in His infinite mercy spoke thus to me: "Rise, O, true heart, thy moment has come. Fear thee not. Thou shalt sleep the sleep of the brave. Thou art a Rajput, thou shalt die so that the name of Chittore shall ever live after thee. Thou art fighting for the glory of thy Lord Maharana and his brave spouse Maharani, and more so for the defence of thy birth place and the honour of a certain beloved face"

My pulse quickened—thank Ishwar not with fear as I dwelt haltingly on the last words of my good Angel. I was impatient to see the morrow—the day on which I would lead

of this heavenly music under the soft light of the moon memories were aroused from their sleep like souls on the wide field of resurrection and the past once more turned to life. And in that divine solitude the memory of many golden hours in my life gleamed before my inner vision like steps leading to the heavenly garden of bliss, where ,'the rivers run like chain of light." I saw myself as a child praying at the knees of my mother, as a sturdy youngster romping the wild woods with not a thought to cloud my juvenile mind and then I saw myself as a young man smitten with a great abiding sorrow—the death of my parents. But I was young and as years rolled on my sorrow lost the sharpness of its sting. Time is a great healer and in due course I took to arms—the time-honoured profession of my ancestors. Many a battle had I fought and Bhimsing's bravery became a bye-word. What pleasant memories! But sweetest of all was my great love for Rukmini. a love which she reciprocated. And we were happy in each other's love. Then the great day dawned when our love was bound with the silken bond of matrimony which no earthly power could break or keep asunder. I was madly happy and time smoothly glided away. To crown our great happiness our curly haired, rosy cheeked son Radhu was born. I wondered if anyone could bear such happiness. It was too good to last.

As I looked on, my thoughts were not of Life, nor Death, nor the World, nor the spaces beyond the World—but of Rukmini and Radhu. I knew that Ruki, as I used to call my wife, would walk through the funeral pyre to meet me in the 'Land of Bliss'. But what about my sturdy little son Radhu!? Who would look after him after my death? What would become of the rose, for whose sake the smart of a thousand thorns were endured? Love is an unfathomable enigma. Sometimes what a giant does true love make of man and at others how weak the poor creature feels who has the misfortune

THE CROSS OF DUTY

I sat perched on a lofty hill and contemplated the Universe. Through the ranges of hills; between the coral rambles in the trees, I saw how the plains stretched miles around like a sea without a sea shore, 'far away it was as if the sky had let fall a spider web in its own azure colour over the green of the early spring'. Studding these wide plains lay horses and mules, tents and elephants of the mighty king, Alauddin Khilji. As far as I could see, his hordes had spread their tentacles all round the old, proud fort of Chittorgarh. It was not a new sight to me. I had seen this many a time in the past but that day as I wistfully gazed at the wellknown landscape a slow conviction stole upon me that my death was at hand. This gave food for my thought.

I was ordered by my Lord, the Maharana, to lead the cavalry charge on the morrow. I felt proud and grateful for the honour done to me, although in the innermost depths of my heart I felt convinced that by that time on the morrow I would be a shapeless mass of clay with the vital spark of life gone. But death had no terrors for me. I was a Rajput soldier—a seasoned warrior who had more than once seen death at close quarters. Yet I felt a vague sense of fear. My blood boiled, though my heart sank, and I knew that depth of trembling apprehension that is True Fear—the fear for another whom we—whom we—love and esteem.

Thus I meditated. I lost count of time as I contemplated eternity with chin in my hand. Anon the Queen of Heavens rose in all her majesty and the whole universe was engulfed in the cold spirituality of her radiance. A glittering stream of song flowed through the purified atmosphere. By the strains

the fallacy of religion and spiritualism and then, he will fully agree with what Ethel Mannin wrote in her book "Confessions and Impressions" (Penguine). She wrote "A philosophy of life, it seems to me, is of so much more practical value than religion. Religion is for the defeated or those who lack courage. I believe in life—which is to say, in myself as part of the physical world we know, the world of flesh and blood, sap and spermatozoa, cells and atoms and chemical elements."— And it is quite true. Modern biology (bio-chemistry), psychology, theory of Relativity and the wave-mechanics have disclosed quite explicitly that the substratum of the world is matter, that matter preceds mind. Thus, once the Radical realizes the eminence of the physical universe, he will automatically develop a spirit to struggle through all the difficulties and acute problems that may confront him. He will create in him, the virtue of toleration and a sense of values, which are the very characteristics of a civilized society. He will revolt against injustice, cruelty and dictatorship. His programmes, whatever they may be, are always clear-cut. The Radical is a socialist, a democrat, a cosmopolitan. He knows only one religion— "Service of Humanity"

GOVARDHAN SASTRI,
(*Senior Inter.*)

is the sign of life. Therefore philosophical revolution manifests itself with the downfall of conservatism which is fatal to any society, especially in an age when science is marching ahead triumphantly. No educated Indian youth can be so foolish as to wish to see his society completely stagnant, with no socio-economic progress. But, to expect a social Renaissance is to live in a fool's paradise, unless the youth does dare to revolt against the 'Holy Family' of spiritualists, conservatives, status-quo-ers and reactionaries. He must study each and every theory and principle critically and rationally. If he finds it unable to stand the test of logic and reason, he must be bold enough to recalcitrate against it. He must train himself to possess a rationalistic outlook. He must radicalize himself in order to solve the socio-economic problems of his society—the Indian society. That can be well done by discarding once for ever, the pre-conceived prejudices, blind faiths and superstitious beliefs that he has nourished for so many years. It is quite certain that all his foes and even many of his friends may launch an ideological war against him, but only an adamentine conviction and a rebellious spirit can be triumphant, in the long run. Critical moments do occur, no doubt, in his life when he is likely to lose heart and take refuge in the reactionary camp, either to gain cheap personal prestige or to please some of his friends. But, as Harold Lasky wrote in his book "Liberty in the Modern state" (Pelican), "Truth can be established by reason alone; departure from the way of reason as a method of securing conviction is an indication always of a desire to protect injustice." Reason does not know complacency. If the Redical wants to profess any principles, he must study a great many books of social, economic and political sciences. If that is done, the Radical will realize that man is not a spiritual being but the product of the physical environments. He will know that the laws of the universe are not governed by any external power, but that they are inherent in the process of evolution itself. If he studies biology and psychology, he will understand

day a Mahatma! One of my friends, after passing the examination, celebrated the Satyanārāyana feast in his village. Pointing to the sky, my friend was frank (!) enough to disclose the secret that it was He who helped him in passing the examination! Next year, the darling of Bhagwán turned over the pages of Payām thrice but the poor fellow could not find his name! I did not, anyway, wish to add to his grief by enquiring him the whereabouts of his Bhagwán, because I fully knew that he himself would realize the real cause of his failure.

This orthodox mentality along with religious prejudice, blind faith and wicked superstition is the sole cause which has rendered Indian Renaissance impossible. It is eating into the very vitals of our society. But with all this, the Indian youth is not to be blamed any way. Being the product of the social environment which besieges him, he adapts himself to that particular pattern. Our present society itself is built upon an orthodox structure. Naturally the average youth, though desiring to do something substantial, is perplexed as to which way to choose. He is so much accustomed to the pitiful social customs that he sees every thing in a mystic way and false manner because society has presented to him a coloured glass of false notions and fictitions ideologies. The various movements around him, no doubt, impress to a great extent upon his vigilant mind but to no purpose, unless he has the capacity to distinguish which is which. It has almost become a fashion for every body to declare himself the follower of such and such a party! It is very interesting to observe with a critical intelligence, the most widespread idiosyncracies of our society. A great bulk of it groans under the tyranny of words of propaganda by the different parties.

What we want to-day is a philosophical revolution. The word 'revolution' does not mean what an ordinary reader is likely to take for granted. Revolution is a radical change. It

Nevertheless, history proves that only the progressive forces, having a rebellious spirit can claim to be the standard-bearers of progress and civilization.

Europe has gone through a Renaissance two hundred years ago, while India, though chronologically in the twentieth century, is historically two hundred years backward. The reasons are not far to seek. The religious, moral and spiritual teachings are rooted deep down in the Indian hearts and therefore the average Indian thinks that all the wordly affairs are conducted by the Almighty! Everything, according to him, is pre-ordained by Him! The result is that he lacks in a creative impulse, an initiative power, a struggling capacity and a will to face the realities of the world! The desire to renounce the world, in order to achieve a spiritual happiness in some external world, has dominated millions of Indian hearts. Disregarding the fact that man is a physical being of flesh and blood and not merely a tiny cog in the gigantic machine, propelled by the Almighty, the orthodox Indian youth feels sublime delight in floating along the clouds of wishful thinking. He may even know what is rationalism, but he shall not fail to insist: We believe in God simply because we have to believe! It is interesting to know whether he inclines to decide the question: which leads to a successful life: Rationalism or Blind Faith ?

And the so-called educated students takes refuge in superstitions and time-honoured beliefs, whenever he lacks courage to face the realities. The candidate going to the B. A. examination does not hesitate to stop before a temple with books in his arms and his eyes shut! But the pity is that so many darlings of the 'Almighty' get plucked in the examination. The Hindu youth, leading a hostel life, is well prepared to observe occasional fasts in the dining hall, perhaps with the idea that since Mahatma Gandhi does the same, he may himself become one

definite, nothing stable, nothing conclusive. Various isms, various cults, different theories and conflicting philosophies, one after another, dance before his mind, and he grows more and more perplexed, groping in the darkness with no aim and no purpose. Sometimes he is lulled with the hope of a New World Order and sometimes he shudders with the thought of the Fascist storm-troopers! Ultimately, he is confronted with the abstruse question—What is my part in this world-drama ?

* * * *

Let us try to find out, with a scientific and rationalistic outlook, whether there is any way out of this chaos and whether we can do something substantial for the cause of Indian Social Reconstruction.

Social reconstruction is not the burning necessity of any one particular nation. Every nation of the world wishes to raise the standard of its society to a higher and higher level. Those, that have already had a philosophical revolution, are marching on the path of progress and civilization, while other nations like India that are committed to the teachings of spiritual and pseudo-moral dogmas, are still backward econ-mically, socially, and politically. The characteristic feature of the average Indian is his dislike for 'materialism' or the so-called Western Civilization. He goes to the extent of attributing all this worldly chaos to materialism. He is proud of the spiritual genius of India, forgetting that Indian philosophy contains a large amount of materialism. He even expects that, ultimately, the whole world will have to kneel before India for her sublime spiritual culture! But as he is likely to think, spiritualism is not the speciality of India alone. The European nation, which the average Indian curses from the bottom of his heart, was in the medieval period the hot-bed of spiritualism; the student of European history cannot forget the wicked and barbarous actions meted out, by the Roman church, to the free and scientific thinker—Hapatia, Bruno, Gallileo and others,

REVOLT FROM THE RADICAL

Our need is for a new philosophy, a new social order, a new religion—a religion not of God, but of Man; not of Fear, but of Freedom; not of Heaven but of Earth.

—Ethel Mannin.

The world is witnessing a severe crisis. It is being throttled by an epoch-making event and the common man-in-the-street is eaten up with growing restlessness. The ignorant masses with no education and the poverty-stricken human beings with no purse, are unable to manage their costly lives due to the growing dearness of the market, while, on the other hand, the educated strata–the students, professors, writers, journalists, leaders and thinkers—all are caught up within the vicious circle of chaos and confusion. It is not unnatural, any how, that whenever there is an epoch-making crisis, confusion is bound to arise like a great storm which seeks to devour up the whole humanity, but only those who are weak, ignorant, pusillanimous and pessimistic are drowned in the fathomless depths, while realists and diplomats escape the torrents very cleverly. Shakespeare construed philosophy to be the sweet-milk of adversity; in the greatest adversity as the world is witnessing today, the philosophical outlook of all the great thinkers of the world is changing its ways. New values are springing up; new conceptions are gaining ground. When old structures are collapsing in some countries, others are engaged in a severe conflict between the reactionaries and the progressivists.

While all this goes on, the most confused mind is that of a modern youth. He studies books, reads newspapers, hears lectures, but when he thinks, he sees before his eyes nothing

"If the key to the puzzles of this distracted world can be said to rest in any single fact it is to be found in the relations of the British commonwealth and the American commonwealth".

America has got some of her islands in the Pacific. The Philippines, the Hawaian, the Kosas. In the Atlantic if the west African ports, the Portuguese and Spanish islands are seized by Germany, America will be in mortal danger. Therefore America decided to play her heroic role with the Allies. Mr. Stimson's speech throws light upon this.

The immediate reasons of American intervention are the sinking of American ships like the Robin Moor, the fifth column activities in South America, Brazil and other states and the fall of France. Matternich said "When France catches cold, Europe sneezes". The sneeze came from the New World.

Thus due to these reasons America broke her statute and passed the historic Lease and Lend Act in 1941. The Act set apart a huge sum of 1300 million dollars for the supply of defence articles,

(*a*) Weapons, munitions, air craft, vessels and boats.

(*b*) Machinery, tools and raw materials. The President was authorised to look after the supply of these to the Allies. By this America became in the minds of President Roosevelt, an "*Arsenal of democracy*". "The delivery of supplies to Britain is imperative", said Roosevelt and therefore supplies under convoy system are being made to the Allies. The recent meeting of Mr. Churchill and President Roosevelt has confirmed the opinion that America is determined to fight out the Nazi peril by helping Russia and the other Allies.

Thus it is that America has avowedly directed all its resources towards helping the Allies to extripate the Nazi menace. As in the last war, perhaps this manoeuvre of America would determine the future and would make the world safe for democracy. We hope the collaboration of America and Britain would also result in the establishment of the New World Order: We agree with Mr. Gardiner, the writer of "Anglo-American future";—

fore in the present war too, America could not break her traditions and leave its friend in the lurch.

It does not take a long time for two people with the same ideologies to meet for a common cause. America believes in Democracy. The world has not forgotten Lincoln's famous pledge:—

"The government of the people shall not perish from the earth".

America was not a nation prepared to tolerate the State Gangsterism of Germany. America was not ready to take to the aggressive Nazi and Fascist philosophy. Undoubtedly democracy was the only ideology that had found way in the veins of the Americans. 'To make the world safe for democracy', she had entered the gamble in the last Great War. And for the same reason obviously, she has repeated her past.

"The U.S.A. will never survive as a happy and prosperous oasis of liberty in the midst of a desert of dictatorship".—Roosevelt.

The economic reasons were foremost in moving America to direct action. America is an industrial State with its commercial relations with good many States in the East and the West. In China alone, she has invested nearly 22 crores dollars. Therefore she could not tolerate that her trade and commercial relations should break in case the Nazis and the Japs rule the East and the West.

America's interests in the Pacific, Atlantic and the Mediteranean are paramount. These life-lines of communications were and are incessantly threatened by the Axis powers. In case these become "secularised" under the paramountcy of the Axis powers, American trade would greatly suffer. In the last War too America had tried to internationalise these because of obvious reasons. The same motive prompted America to give up her isolation.

AMERICA & WAR

For good or evil, with or without its own consent, the United States is now irrevocably involved in the web of the world affairs. No more she looks on the drama that is being staged in Europe and the Middle East like a spectator. No more can she turn a deaf ear to the still sad music of humanity. She has broken the ring of isolation and is one of the important allies of the world's freedom, She is determined to see the war through.

In the beginning of the war America was playing her traditional role of an onlooker. Wrapped up in her haughty seclusion she was repugnant to break her famous Monroe Doctrine. "*Honest friendship with all nations and entangling alliances with none*" was the theme of her foreign policy. It was only after the re-election of Mr. Roosevelt that America found herself placed in such a position that intervention became incumbent.

Why did America give up her policy of isolation ? The reasons for this are not far to see. If we dwell in retrospection, we would find America always unfriendly towards Great Britain. Right from the American War of Independence the relations between these two have been strained. But they were mostly due to misunderstanding. An American girl rightly pointed out to Lord Grey :—

> "I think that the two chief obstacles in the way of our unity are———in England, ignorance of the Uuited States and in the U.S.A. misconception of England ".

Herein lies the chief reason why the two worlds did not meet. But the last Great War patched up the broken friendship and these two nations became very friendly. There-

plans; in this sense Kautilya always ruled over Chandragupta. It is beyond the scope of this article to deal with their organizations, invasion and victory. It is enough to say that it was Kautilya who made Chandragupta the King of Magadh. All the Puranas unanimously proclaim that Vishnugupta (Kautilya) installed Chandragupta on the throne of the Nandas. Kautilya played the same part in the history of Ancient India as Bismark played in Germany. Kautilya unified, extended and consolidated the Magadhan empire. The Mauryan dynasty is greatly indebted to Kautilya for its installation. He ushered in a new epoch in thc political history of India. With him in fact begins the history of a unified India.

B. S. RAO,
M. A. (Previous)

attitude behind the book is one of utter indifference to all sentiments. And since Kautilya, the king-maker of Chandragupta, and the Kautilya, author of the Asthasasthra, are one and the same person, it seems improbable that he destroyed the Nanda dynasty only with the intention of taking revenge. The insult was a good pretext for Kautilya, and he fully utilized it. This incident of insult happily coincided with objective and subjective situations of Kautilya.

All the material at our disposal goes to show that Kautilya went into a self-inflicted exile. All the traditional accounts, though different in detail, concur on one point that Kautilya met Chandragupta outside the pale of Nanda sway. Kautilya was impressed by the genius and intelligence of Chandragupta, and found in him a good substitute for the Nandas. It is not my purpose to sketch the ancestry of Chandragupta; suffice it to say that he came from a royal family which was deprived of its royalty by the Nandas. Chandragupta was also working for the overthrow of the Nandas. Chandergupta wanted a kingdom, Kautilya a King. The aim of both was the over-throw of the Nandas; only the motives differed. Chandragupta was actuated by personal and selfish motives, Kautilya by impersonal ones; he wanted one as King who would crystallize his political philosophy into concrete shape, and govern the kingdom on his principles; and, on the other hand, Chandragupta wanted an ally who would help him in realizing his aim. The interests of both being identical they allied themselves against their common foe. Such alliance, by its character, is rare in history. It was an alliance of two wonderful personalities of Indian history. One without the other could not have established the Mauryan dynasty over the throne of Magadh. Kautilya was a great thinker and a shrewd politician; Chandragupta a man of action and a worrior. The combination of the two ensured success in their efforts. Kautilya planned, Chandragupta executed the

wanting. Therefore it is no wonder if Kautilya resolved to overthrow the Nanda dynasty, and establish another of his own liking. Here was the ideological clash between Kautilya and Rakshasa. The latter, perhaps, wanted to reform the Nanda rule, the former to extirpate it. Rakshasa was a fantastic loyalist, Kautilya an uncompromising revolutionary. But both were equally great statesmen in their own way. The fundamental difference between the two was this: In Rakshasa statesmanship was subservient to sentimentalism, in Kautilya all was subservient to statesmanship. He was both a practical politician and a scientist. He was always governed and directed by sound logic and reason. He had a deep faith in his mission.

Such was in brief the intellectual attitude of Kautilya.

Kautilya was looking for an opportunity to leave the court of Nandas, to organize an army and attack the kingdom from without while his party would create further dissensions in the court and thus weaken the strength of the Nandas. The wished-for opportunity was not late in coming. It is said that one day the Nandas insulted Kautilya in the court, and Kautilya took an oath to destroy them as an act of revenge. Extraordinary stress is laid on this oath, both by ancient chroniclers and modern scholars. I, however, refuse to believe that merely the sense of insult could have carried Kautilya to such extremity of overthrowing a whole line or dynasty, and installing an altogether new one. This might have been an immediate cause for taking a direct action, but to make it an all-important and sole cause for the revolt against the Nandas and the overthrow of the Nanda dynasty is, I believe, far from the historical reality. But, if this becomes true, then this Kautilya who is carried away by sentiments and emotion must certainly be different from the author of Arthasasthra who subordinates all feelings, even sense of religion and morality, to his political ends. The psychological

THE ROLE OF KAUTILYA IN THE POLITICAL HISTORY OF INDIA

Kautilya, author of the Arthasasthra, stands as a dynamic figure in one of the most chaotic and formative periods in the political history of Ancient India. The short but sweeping raids of Alexander the great had caused much disturbance in the society which was just calming down from the great religious upheavals. The sway of the Nandas, the rulers of the Magadhan empire, was undergoing transformation. Their unbounded avarice, exorbitant taxes, favouritism towards one party and utter indifference to the tranquillity and happiness of the people at large, court-factions and unprogressive decentralization of the Government, all these and many more minor things created restlessness and dissatisfaction, and a consequent sense of revolt among the ruled. The religious struggles which preceded Kautilya created many sects and diverse interests in society. It lost all harmony and concord. The society had become a museum of rigid customs and manners, castes and creeds, sects and by-sects.

Such was, in brief, the environment. Kautilya is supposed to have been a minister in the court of the Nandas. He is also said to have been the leader of a party antagonistic to that of Rakshasa, the most faithful minister of the Nandas. So Kautilya led a revolutionary party which must have been popular in the country. His attitude towards the Nandas and their Government was one of repulsion and revolt. His book, the Arthasasthra in which we have a faithful exposition of his mind, goes to show that he desired a strong central Government, rule of law, social uniformity and economic prosperity of the people. In all these the rule of the Nandas was found

establish the principles of love and mutual brotherhood and make us realise the parliament of man and the Federation of the world. Hence all hearts and souls rest at the feet of the Saint of Sevagram.

VIRENDAR BAHADUR,
B. A. (Senior).

lived and practised provided one has the lagan (intense desire) for it. His life has been a burning lamp of sacrifice and love.

As a political figure Mr. Gandhi may and does excite controversy. Not all are prepared to accept his shibboleths and solutions, even his cult of Non-Violence has been a target of attack. But stripped of his political importance, derided as a prophet, dismissed as he often is as an impractical idealist Mahatma yet emerges as a great humanist. It is for his essentially humanitarian instincts, for his love of the common people that history will remember this remarkable man. What General Smuts describes as "his fundamental and universal humanity" has an imperishable quality. Mr. Gandhi's humanity is profound and knows no frontiers of race or religion. Chivalry to the opponent is among the first articles of Gandhiji's faith, to take advantage of another's difficulties is contrary to his creed.

Tolerance and sympathy are the keynotes of Mr. Gandhi's character. To him Satyagraha connotes not merely abstention from violence but the positive quality of doing good.

But to regard him merely as a Sanyasi who has strayed into politics is to misread the Congress leader completely. Gandhiji will be remembered chiefly for the moral values he has imported into politics "not so much as a man of action or a man of thought as a man of life".

When the din of controversy has died down and history takes stock of his achievements it will recall him as the epitome of the civilised man who strove to leave behind a better world than he found. In this distracted world where selfishness and untruth predominate and brothers fly at each others throat it is this life, and this life only which can help to dispel the dark clouds of ignorance and shameful atrocity and

his life. He was subject to the sins and weaknesses of the flesh as he was born "The poor creature man"; yet he tried ever to 'rise higher' by his fall. Throughout his life we find that he tried to develop and propagate the fundamentals of every religion. He proceeded to England to qualify for the Bar where his struggles with superficial artistries of western civilisation brought out his clear indomitable will as a 'Higher man'. He realised that faith is stronger than words and rituals and is the greatest Tapas and Yoga for the attainment of the truth. He realised the hollowness of reason expounded by scientists in reasoning out the higher values of life. 'Faith transcends reason'. His exploits in the regions of politics and public life are many and various, and are known to every Indian. Throughout his life we clearly find a man trying to cut away the meshes of human desires, to clear the atmosphere of falsehood and chicanery whether it be diplomacy in politics or drive in ordinary society and to breathe in the fresh pure air of truth. All his efforts in the field of politics have been directed to that end. His solid moral character, his Pauline sense of charity and his desire to live an austere life have given him personality which has changed the very face of Bharat Mata whose beloved son he is. To him service of the poor and the oppressed is an ideal of God. Wherever he moves people around breathe the air of equality and fraternity which is more than being written on the tablets of a constitution. He is an ideal Karm Yogi, every one who walks on the path of untruth and every movement or institution which battens upon oppression and falsehood feels awe and almost succumbs to the force of this personality. He is an apostle of non-violence in its extreme form, 'Non-Violence in thought word and deed'. Truth to him is dearer than his very life. He is a man who has shown before our very eyes that the ideals of truth and Ahimsa are not impracticable but can be

THE SAINT OF SEVAGRAM

The secluded village in Wardha formerly known as Shegaon is now famous as Sevagram the village of service. It is humming with activity a place of pilgrimage as it were to all those yearning for political freedom as well as spiritual bliss. Who is it that has cast such a spell ? You will be directed to a cottage where that bewitchingly inspiring personality will be playing with the Harijan boys, that fragile figure is a store-house of enormous spiritual magnetism and strongest will power. This extraordinary piece of nature's handiwork is no other than the most revered personality of modern times—he is the beloved Bapu otherwise known to the world as Mahatma Gandhi. And the weapon he makes use of, namely soul-force, in quelling armed might and in achieving his political aims is the weapon of Non-Violence, which, as he says "is the first article of my faith................the last article of my Creed".

On the second of October (1941) Gandhiji celebrated his seventy-third birthday. Gandhi Jayanti was celebrated throughout the world, and the eminent personalities of the world paid him homage. Every year visitors pour in to pay homage to the shrine of humanity. The Saint of Sevagram cherishes the highest ideal of Ahimsa, non-violence or passive resistance as his Creed. Day by day his faith in non-violence is becoming stronger and stronger. He is an Avatar, and an emblem of purity and truth.

The year 1869, the second of October is memorable in the annals of the world when Mohandas saw the light of day in Porbandar. The influence of his mother was the strongest in his life. From early childhood he imbibed the cardinal principles of Jainism, of truth and Ahimsa, and transmitted them into

Right he was and always guided by the convictions placed in his mind by a Divine Providence,—great, benevolent orthodox—possessed of far sighted statesmanship, greatly ahead of his times, stern in meeting out justice, yet with the good of his subjects nearest his heart. How greatly, wrongly, nay lightly blamed as a despot and a tyrant", murmured I.

"Get up Saeed!" cried one of my friends "if you have quite done raving about Sultan Mohammed Tughlaque."

I opened my eyes. "Then it was a dream", said I to myself":

"Yes, a dream, but a dream at once real and beautiful", answered my heart.

I still bear impressed on my mind the image of the white-robed Sultan as he stood talking to me, his noble features, now grave and sad, now indignant and again benevolent and smiling. May others see him as I saw him for I was privileged to see the Sultan without the trappings of his Royal office and to feel the gentle, refined heart that beat under the scarlet and gold of royalty. This is the only prayer I can fittingly offer for the Sultan.

SAEED AHMED MEENAI,

B. A. (Previous) class.

"Wait a bit", said the king, "Let me give you the whole account. My first attack met with some success but the second resulted in failure and the loss of many lives. Only ten soldiers escaped to tell their melancholy tale. The failure was due to the scarcity of food and ammunition. The hillmen too, offered stubborn resistance and the heavy rains and intense cold also contributed to the failure in no small measure. Another cause of failure was the treachery of my rear-guard who did not support the vanguard. I punished the rear guard severely and some people blame me for this but they seem to forget the ruthlessness of Bulbun in his suppression of Tughral's revolt. All that is remembered is to Bulbun's credit and it is said that his stern measures were necessary for the preservation of a strong central government. But in my case these measures although equally necessary, are considered barbarous. Would there be a more flagrant case of prejudice?"

Again I bowed before the storm.

For a moment there was complete silence. The sultan appeared to be in a reverie, as if revisiting after the lapse of all these centuries, the scenes of his earthy toils and triumphs. Then he lifted up his head, his eyes shining, and a certain calmness and serenity illuminated and transformed his features.

"Then you are satisfied" said the sultan gently.

"Perfectly, my Lord! perfectly satisfied." I readily responded.

"Then farewell, and let me depart. Don't forget my arguments. I go with satisfaction.....I have completed my task. Now begins your work. Go and reveal to the world what I have told you", exhorted the Sultan.

I saw Sultan Mohamed Tughlaque the ill-starred idealist and one of the most learned, just and dread-sovereigns gradually disappear from my sight.

negotiating these passes. Is it not a matter of gratitude to me that no sooner were the obstacles patent to me than I abandoned the expedition.

I never coveted Khorassan as a part of my Empire. My sole object was to establish Military out-posts in Afghanistan to meet the Moghal menace to India".

"I am sorry to have wasted so much of your Imperial Majesty's precious time", said I.

"No, no, don't say that. It has long been my wish to disprove the reckless statements made about me by some purblind historians, who know not even the first principles of historical research and regard it their foremost duty to criticise and blame Muslim Kings without rhyme or reason. "My August Sovereign", said I, "May I be enlightened about your attempted conquest of China which seemingly resulted in nothing more than the loss of countless human lives and endless misery."

"Again the same sort of mistake", thundered the sultan, "Mohammed Kasim Frishta and that long band of unimaginative chroniclers and annalists, who followed in his wake, blundered in construing a punitive expedition to a mountain principality in Tibet as an attempt at the subjugation of China. All that happened was, that a small state in Tibet tried to defy my regal authority and I despatched an army to chastise its ruler. Frishta was mistaken but Burney the contemporary historian depicted the expedition in its true colours. The Moorish traveller, Ibn Batoota too, has set forth the real facts of the case in the account of his travels in Hindustan. Do the canards of Frishta and his disciples need any further repetition?

"Certainly not", I hastily acquiesced, not a little disturbed by the rising wrath of the Emperor.

At the time Khorassan was in a state of confusion and disorder. It was under the rule of Abu Sa'id a very young ruler who could not control his nobles. The ruler of Egypt, who was my friend, took advantage of the disturbed state of Khorassan and threatened to invade and conquer it. Simultaneously some Khorassan nobles whom I had given protection at my court also recommended the conquest of Khorassan. In the face of these tempting conditions, if I undertook an invasion of Khorassan, no sane person can blame me. This last piece of information is for the benefit of those learned fools with biased minds, who pose as authorities on my reign, but lack the insight to realise that my invasion of Khorassan was only a bye-product of the measures I took for the protection of India against moghal invaders".

"May I be told O, my much-wronged Sultan, what led to your failure in Khorassan"? next ventured I.

"Failure in Khorassan ! I just told you that I never wished to conquer Khorassan," replied the Emperor. "Your Royal Pardon," returned I. "I wish to know the reason of your failure in your incidental incursion into Khorassan so that I may make a fit rejoinder to those historians who go by superficial appearance alone, and do not admit that you never aimed at a permanent conquest of Kkorassan and consequently censure you for failure in your supposed enterprise".

"Yes, you may know the causes of the failure of my imaginary attack on Khorassan," continued the Sultan, "the first reason was that the king of Egypt proved a faithless ally. Instead of helping me he joined hands with Abu Sa'id. How difficult is the passage of the passes of the Hindukush for large armies, like mine, was then not as obvious as now. My successors of the twentieth century for the additional information and better means of transport they possess, feel shy of

This would undoubtedly have saved the Imperial Treasury from being drained of enormous quantities of silver and gold. But injustice, tyranny and breach of faith were far from my mind."

I listened to the Sultan with awe, not only because of his exalted station in life and the fact that he was a visitor from the regions beyond the grave but also because the great Sultan was possessed of very great powers of speech and everything that he said was based on reasons.

"What more would you like to ask?" said the Sultan, beaming upon me. "Would your imperial majesty," asked I, "Be graciously pleased to enlighten me as to the expediency of sending an expedition to Khorassan?" The emperor was touched to the quick.

"Eh", said he, "That is the one act that I wish to justify before all other questions relating to my policy. Foolish historians instead of thoroughly investigating the facts with unprejudiced and balanced mind, recklessly and even maliciously endorse all the calumnies spread about me by their unwise and biased predecessors.

I never attempted the conquest of Khorassan. In the year *729 Hijiri*, after repelling an attack of the moghuls I determined to adopt measures which would serve as a lasting check against them. The first and the most essential measure in this connection was the establishment of military stations on the north-western marches of the empire. With this end in view, I decided to strongly garrison Afghanistan.

In those days, a part of Afghanistan was under the rule of some Khorassan nobles. Ziauddin Burney, the contemporary historian failed to understand the significance of my stationing some of the forces beyond the Sulaiman Range and mistook the march of my armies into Afghanistan, as an attempt at the conquest of Khorassan.

people returning from Deogiri to their original homes in Delhi and the provincial revolts, which occurred about the same time, had imposed a severe strain on the Imperial Treasury. The dearth of precious metals had placed the issue of silver and gold coins out of the question. This greatly hampered trade and commerce.

Well nigh six hundred years after my demise, you now realize that the purpose of a coin is nothing more than to serve as an instrument of exchange; but in China, paper money had been in use even before my time and some thirty or forty years' before my accession to the throne, the Shah of Persia following the example of the Emperor of China had introduced paper money, bearing the royal seal of his realm. My introduction of token currency was, therefore no innovation even in that remote age. The only novelty about my token currency was the use of copper instead of paper. I naturally preferred copper to paper as the former is more lasting than the latter. I ordained that the value of the new copper coins would be the same as the value of gold and silver coins of the same weight and, to be quite fair, declared publicly, that anybody could exchange at the Imperial Treasury a copper coin for a gold or a silver coin of equal weight. Unfortunately the new copper coins lent themselves to easy imitation, and forgery became rife in the land. No stone was left unturned to check forgery but all was in vain. Copper coins, which had become as priceless as pebbles were therefore, withdrawn from circulation and coins of equal weight paid out instead by the Imperial Treasury. Some half-baked historians condemn me as a tryannical and stupid ruler. A glance at the above mentioned circumstances should be enough to refute the charge of stupidity and the answer to the charge of tyranny is equally obvious. Could I not, had I been so minded, have refused to pay out gold and silver coins in exchange for copper ones

capital, therefore, proved a failure. The Moghal invasions also contributed in no small measure to the transfer of the capital from Delhi to Deogiri.

The belief that I always acted like a tyrant and a despot is hardly consistent with my orders issued as soon as the transfer of the capital had proved a failure, that the people who had come to Doulatabad were at liberty to resettle themselves in Delhi.

I was all the time endeavouring to improve the miserable lot of my subjects. This can be substantiated by, among other things, the fact that as soon as I saw that it was not possible in the unfavourable conditions obtaining in Deogiri to effect any improvement in the poor plight of my people, I asked them to return to their homes in the north.

"Tell me then if there is yet room to doubt that the sufferings of my people were due more to natural calamities rather than to my alleged despotic rule."

"None, Great Sultan", I humbly submitted, whereat the Emperor's countenance lit up with a smile of satisfaction at my speedy acceptance of his view.

"Proceed, if thou shouldst have any more questions to ask," said the Emperor.

"Lord", said I, "How are your historians to explain your 'Token currency'?"

"Hearken", said the Sultan, "From the beginning of my reign, the then existing currency system and its weaknesses loomed large in my mind and if you examine the circumstances carefully, you will have to confess that in introducing token currency, I took the only course open to me. The expenses of the transfer of the capital, the famine and the Moghal invasions which followed, the compensation paid to the

been subdued, giving an importance to the Indian Peninsula, which it had not enjoyed before. It is true that my empire extended over a great area in the north also, but Delhi, too, had many drawbacks as the capital of my vast empire. It was within easy reach of invaders from the north. Deogiri occupied a much more central position. In the interests of a strong and lasting rule in the Deccan, the location of the capital in the south was absolutely essential. The best way of transfering the capital was to order the inhabitants of a single town in the north to migrate to a southern city. So I chose Deogiri, renamed it Daulatabad and ordered the people of my old capital to move on to Daulatabad. I also intended to repopulate Delhi with the people who inhabited the areas round it.

Some historians blame me for acting like a despot,—ruthlessly. But this view can be disproved by examining minutely the facilities provided for the exodus from Delhi. A special road was constructed which linked Delhi with Daulatabad. The government bought all the lands and property in Delhi and paid for them whatever prices were demanded by the people.

All those bound to Delhi were supplied with food and there were rest houses all along the way from Delhi to Deogiri. People who had no money to pay for the services rendered to them were fed at the expense of the state.

The unconfirmed account of Ibn-Batoota, the Moorish traveller, that a blind and lame person was found in the city and dragged to Doulatabad, is quite incredible and baseless.

But the transfer of the capital proved a failure because of the famines which occurred in the next few years in the Doab. Famines always lead to a large increase in violent crime. Large tracts of the country were laid waste. My scheme for the supply of grain from the Doab to the people of the new

We reached Thatta at dusk. Till about ten o'clock, we sat discussing and criticising Muhammad Tughlaque's reign. I, in particular, criticised Muhammad Tughlaque very severely, quoting Frishta as my authority. We went to bed at about 11 o'clock and almost immediately I was fast asleep after the long and tiresome journey. Then I saw Muhammad Tughlaque. I am not sure whether it was some photograph of the Great Emperor which I had once seen and forgotten or a really supernatural likeness of the long-dead Sultan that had materialised before my sleep-laden eyes.

"Are you not Muhammad Tughlaque?" said I, to make sure. "Even so", said the white robed vision.

My heart beat fast. The remarks I had made a few hours before were still fresh in my mind. This was no doubt a golden opportunity for ascertaining the real facts relating to his policy and reign from the Sultan. I felt that it was only fair that Muhammad Tughlaque should have a chance to disprove the uncomplimentary views commonly held about his policy and reign. "Dread sovereign," said I, "will you deign to honour me with a talk on the happenings of your reign?" "Yes", replied the Emperor, "Tis that and no other purpose that brings me hither. Hesitate not. Ask and thou shalt be answered."

"Sultan," asked I, "How would you justify your transfer of the capital from Delhi to Deogiri, which resulted in the ruin and death of thousands of your subjects."

"Ha", said the prince, "That is the first in the long list of my supposed sins. But listen. Of the many schemes that I put into effect for the good of my people, the first was the transfer of my capital from Delhi to Deogiri. Deogiri undoubtedly enjoyed a very strong strategical position. In the early years of my reign, the kingdom of the Deccan had

MUHAMMAD TUGHLAQUE AND OUR MODERN HISTORIANS

It was the month of April. My summer Vacation had begun. I had written so many times to my friends, particularly to Shameem but had never received any reply. Before the commencement of the holidays, Shameem had proposed so many excursions, but as soon as the holidays began, he became 'dumb as a drum with a hole in it'.

It was 7 o'clock in the morning. I still lay in bed thinking what to do during the holidays. Suddenly, there was a noise in the street. I thought it was a passing motor car, but not long after, somebody knocked at the door. My servant came running to me and said, "Sir, two gentlemen have come to see you and refuse to give their visiting cards". I at once got up and went out to see who the people were. To my great delight and amazement, I found Shameem and Anver in the drawing room. My joy at the sight of them, beggars description. Nevertheless, I heartily rebuked Shameem for his silence. He said that he had not received any letter from me. After a long argument, we agreed that Anver should decide as to who was at fault. Anver now played the role of Addison's Sir Roger and said, "Much might be said on both sides." On hearing this verdict, we all burst into laughter and thus ended our quarrel.

After a while, Shameem said that he proposed visiting some historical places in Western India and the proposition was carried *nem con.* We accordingly started by train.

After seeing various historical places in Sindh, we came to Thatta, the spot where Muhammad Tughlaque, the greatly misunderstood ruler, had breathed his last.

She killed your mother. One night when the wind was sullen and low she glided in, spread her yellow hair about me, and murmuring said how she loved me. I was pure—pure and good—yours......you were wrong; I killed her....Strangled, strangled her.....". A fit again shook his body—and he coughed blood. He closed his eyes, wearied of the storm. The girl moved and laid him down and covered him. "Roohi—" he began again "Roohi" She fixed her eyes in reply over the beloved face: tears streaming down her cheeks. "I have run my day—Sunset and Night. Many a winter has come and gone—She returns—The airs and the streams renew—but never I......Roohi give me your hand—some water....water...." his words became feeble and inarticulate. The girl lifted up the pitcher from the window, there was no water. She took it and wildly hurried out.

The candle flickered ......The old man became restless. His breast swelled and his eyes became wide and dilated. His hands struggled with something invisible. His lips quivered. He raised his head; made an effort to rise—rose and fell—lifeless and dead.

The girl returned: small drops of sweat over her brows—her looks wild and ghastly. She rushed to the bed. Her father seemed to her as if resting after a tempest. She called him—slowly felt his forehead. Called him again—loudly—loudly—more loudly. She shrieked—the pitcher fell and was broken into pieces. She shrieked 'Father' and fell over the breast of her dead sire.....Raised her head....felt his closed eye-lids......Her eyes were dry......She looked towards the heavens and there her eyes remained. The soul of her father was going beyond the stars with a woman smiling at him, bright as snow, clad in angelic white.

SLEEM, 4th Year.

"It is so dark, child" The voice was feeble and sounded as if out of a grave" Give me light—The moon is full—more light—Yes......look, who comes there! Your –" he could not complete his sentence. A great convulsion:— all his frame shook and he coughed. Roohi who was at the window, opening it to admit more light of the rising moon rushed to his side. In violent energy of the moment the old man raised himself. She approached and supported him against her bosom. She reached her hand to his mouth—it was blood, blood from the heart. Tears from her eyes. The old man held her hand and let it remain near his heart.

"Roohi" he said at last

"Father"

"Did you see? I saw your mother. Why do you weep—She was there, bright as snow, clad in angelic white—winter is come and gone, she died in winter. You were a child—Thirteen years have passed....we loved....we loved. I loved her—your mother. She died......"

The girl was frightened. With wide-open eyes she looked around: the truth dawned on her; and her eyes were blinded again. He began to gaze vacantly through the window towards the moon.

"Look-Roohi...." he was silent, a grim smile qurvered around his lips: "You are mistaken—I do not love her. She is my employer. These fields, this house, these all are hers—but—but I am yours. I love you—why do you look so pale. Do not weep; the babe is affrighted....I was in the fields last night......No—no—no"......he began to shriek, and shrieking wanted to get free of the hands of his daughter: 'Father! Father' she cried. The violence was soon burnt out; and he sank back in her arms again! "Roohi!....Roohi!"....Wont you speak?....She died—left you a child, I reared you up—These hands, these hands—She was my employer I killed her—

THE SANDS OF LIFE

It was a little hut, set beside a bubbling brook, which murmured things mystic and divine, reminding us of the Presence that animates everything around. The gathering shadows had darkened into the night. The only light that gave a weird look to the scene was the candle, that shone from within the hut. The nightingale poured the existence out of her veins in her sad melodies; and the shrieks of small birds, killed perhaps by an owl or swallowed by a snake, now and anon, disturbed the awful silence. The eastern clouds were growing into silver-bright and the moon was slowly emerging almost full in its splendour, smiling in the face of the earth that lay dead and life-less beneath.

Inside the hut, the dim rays of the candle revealed a bed—and an old man invalid, pale and white. Covered with a tattered blanket he lay, his breath passing slowly, with difficulty through his breast. His eyes were sunk, his forehead furrowed and his form awful and exhausted. Beside the bed on the ground, leaning against it sat a young girl. Her eyes were swollen and dry. Her black wavy curls were dishevelled and unkempt. Her head was bent over her chest. Now she raised her head, looked towards the heavens, now she turned and gazed at her aged father——wiped her eyes with her saree and was quiet again.

A great gust of wind rushed in, the candle flickered and the old man turned in his bed.

"Roohi"

"Father!"

APPENDIX I. (*b*)

LIST OF NEW ELEMENTS

H^{3}	Na^{22}	A^{39}	Ti^{51}	Ni^{57}	As^{73}	Si^{85}	Rh^{104}	In^{114}	I^{124}
He^{6}	Na^{24}	A^{41}	Tl^{51}	Ni^{63}	As^{72}	Sr^{87}	Rh^{105}	In^{115}	I^{126}
Li^{8}	Mg^{23}	$A^{35, 37}$	V^{47}	$Cu^{58, 60}$	As^{74}	Sr^{90}	Pd^{107}	In^{116}	I^{128}
Bc^{7}	Mg^{27}	K^{88}	V^{48}	$Cu^{58, 60}$	As^{76}	Y^{86}	Pd^{109}	Sn^{113}	I^{130}
B^{12}	Ml^{26}	K^{42}	V^{49}	Cu^{61}	As^{77}	Y^{87}	Pd^{111}	Sn^{119}	I^{13}
C^{11}	Al^{28}	$K^{43, 44}$	V^{58}	Cu^{6}	As^{78}	Y^{88}	Ag^{102}	Sn^{125}	Xe^{127}
N^{13}	Si^{27}	Ca^{39}	V^{52}	Cu^{66}	Sc^{75}	Y^{90}	Ag^{104}	Sn^{126}	Xe^{139}
N^{16}	Si^{31}	Ca^{41}	G^{51}	Zn^{63}	Sc^{79}	Zr^{89}	Ag^{105}	Sb^{116}	Cs^{134}
O^{15}	P^{30}	Ca^{45}	Mn^{51}	Zn^{65}	Sc^{81}	$C6^{92}$	Ag^{106}	Sb^{118}	Cs^{139}
O^{19}	P^{32}	Ca^{49}	Mn^{52}	Zn^{69}	Sc^{83}	$C6^{94}$	Ag^{108}	Sb^{120}	Ba^{139}
F^{17}	S^{31}	Ca^{47}	Mn^{54}	Zn^{69}	Br^{78}	Mo^{91}	Ag^{110}	Sb^{122}	Ba^{140}
F^{18}	S^{35}	Sc^{42}	Mn^{56}	G^{64}	Br^{80}	Mo^{93}	Ag^{111}	Sb^{124}	La^{138}
F^{20}	Cl^{34}	Sc^{43}	Fe^{53}	G^{65}	Br^{82}	Mo^{99}	Ag^{112}	Sb^{126}	La^{139}
Nc^{19}	Cl^{36}	Sc^{44}	Fe^{55}	G^{66}	Br^{83}	Mo^{101}	Cd^{107}	Sb^{127}	La^{140}
Ne^{23}	Cl^{38}	Sc^{46}	Fe^{59}	G^{67}	Kr^{79}	43^{96}	Cd^{109}	Sb^{119}	Ce^{139}
		Sc^{47}	Co^{55}	G^{68}	Kr^{81}	43^{99}	Cd^{115}	Sb^{131}	Ce^{141}
		Sc^{48}	Co^{56}	G^{70}	Kr^{83}	43^{101}	Cd^{117}	Te^{121}	Ce^{143}
		Sc^{49}	Co^{58}	G^{72}	Kr^{85}	Ru^{95}	In^{110}	Te^{127}	Pr^{140}
			Co^{60}	Ge^{69}	Kr^{87}	Ru^{103}	In^{112}	Te^{129}	Pr^{142}
			$Co^{58, 60}$	Ge^{75}	Kr^{88}	Ru^{105}	In^{113}	Te^{131}	Nd^{147}
				Ge^{77}	Rb^{82}				Nd^{149}
				As^{71}	Rb^{84}				
					Rb^{88}				

Nd^{151}	Yb^{175}	Os^{193}	Pb^{205}
Eu^{150}	Yb^{177}	Ir^{192}	Pb^{209}
Eu^{152}	Lu^{175}	Ir^{194}	Bi^{210}
Eu^{154}	Lu^{177}	Pr^{197}	Po^{210}
Gd^{159}	Hf^{181}	Pt^{199}	Vy^{231}
Gd^{161}	Ta^{180}	Au^{196}	Th^{233}
Th^{160}	Ta^{182}	Au^{198}	Pa^{233}
Dy^{160}	W^{185}	Au^{199}	Va^{239}
Dy^{165}	W^{187}	Hg^{197}	Li^{5} & Hc^{5} Impossible
Ho^{169}	Re^{186}	Hg^{203}	Trans branuim
Ho^{166}	Re^{188}	Hg^{205}	
Er^{165}	Os^{191}	Tl^{200}	
Er^{169}		Tl^{204}	
Er^{171}		Tl^{206}	
Tm^{170}			

DR. M. ZAKI UDDIN, M.SC., PH.D., Dr.Phil.
Physics Dept., Aligarh

APPENDIX.

$2\frac{1}{2}$ Million Years

$$1+H'+C+C^{12}=7+N13+\text{Gramma Rays.}$$

10 Minutes

$$7+N^{13}=6+C^{13}+e+.$$

50 Thousand Years

$$1+H'+6+C^{13}=7+N^{14}+\text{Gramma Rays.}$$

4 Million Years

$$1+H'+7+NN^{14}=8+0^{15}+\text{Gramma Rays.}$$

2 Minutes

$$8+0^{15}=7+N15+e+.$$

20 Years

$$1+H'+7+N^{15}=6+C^{12}+^{2}+He^{4}.$$

APPENDIX I. (*a*)

LIST OF OLD ELEMENTS

H	Mg	Cr	Kr	Ag	Ce	Yb	Yh
He	Al	Mn	Rb	Cd	Pr	Lu	Bi
Li	Si	Fe	Sr	In	Nd	Hf	Po
Be	P	Co	Y	Sn	Il	Ta	Rn
B	S	Ni	Zr	Sb	Sm	W	Ra
C	Cl	Cu	Nb	Ta	Eq	Re	Ac
N	A	Zn	Mo	I	Gd	Os	Th
O	K	Ga	Ma	Xe	Tb	Ir	Ux
F	Ca	Ge	Ru	Cs	Dy	Pt	U
Ne	Sc	As	Rh	Ba	Ho	Au	
Na	Tl	Se	Pd	La	Er	Hg	
	V	Br			Tm	Tl	

$$C^{12}+H \text{———} N^{13}+Y$$
$$N^{13} \text{———} C^{13}+{}_{e}+$$
$$C^{13}+H \text{———} N^{14}+Y$$
$$N^{14}+H \text{———} O^{15}+Y$$
$$O^{15} \text{———} N^{15}+{}_{e}+$$
$$N^{15}+H \text{———} C^{12}+He^{4}$$

Reversible.

Thus we see that carbon and nitrogen remain in the sun in the same ratio. One could suggest hundred and one possible reactions but calculations reveal that others are out of question because Lithium^{5} and Helium^{5} are not existing in nature nor there seems to be any trace of their production in any reaction.

It has been calculated that the temperature of the centre of the sun is 18.5 million degrees centigrade. This theory gives 19 million degrees centigrade as the temperature of the centre of the sun.

It has been possible to formulate this theory by considering the experimental results obtained in nuclear physics laboratories on the one hand and patience and diligence of the astronomers on the other hand.

Below is given the list of the 92 elements believed to constitute the universe. The supplementary list gives the names of the elements isolated by bombarding various atoms.

There are two kinds of stars called Giants and Dwarfs. It has not been possible to generalise the theory for every particular case but so much is evident that this theory is ultimately going to play the most important role in the developement of theories of production of energy. This theory is something like this: imagine a giant oven. On one side of the oven you feed some coal. The coal is broken up into a number of ingredients; the ingredients react together and ultimately end. So naturally if you want to start over again, the oven should be fed with the coal that has come out of the oven itself and thus produce that endless cycle of regenerating the oven with the coal coming out. We find that instead of the coal, we have to deal with the atoms and their isotopes. The cycle starts with permanent atoms, these atoms react with particles, produce isotopes and finally result in the same kind of atoms with which we have started. Thus we get an endless cycle of reactions independent of the surroundings and not requiring any out side help.

Come down from the vagueness of poetry and romance. We start with an atom of carbon that reacts with protons and an unstable isotope of nitrogen is formed, with release of energy. This isotope of nitrogen breaks up into another isotope of carbon again reacts with the protons and gives the normal nitrogen atom with release of energy. This normal atom of nitrogen again reacts with one proton and we get an unstable isotope of oxygen plus some energy. This atom breaks up into a higher isotope of nitrogen and a positive electron. At the end, this isotope of nitrogen reacts with a proton and we get the original carbon atom with helium atom.

orbits and emit or absorb energy when they jump from one path to the other. The problem was how to approach the impregnable barrier? Alpha particles are positively charged, protons have also positive charge, electrons are too feeble and the available source of energy at our disposal too weak. The potential barrier can in no case be passed and thus the "accidental transmutation" obtained by Lord Rutherford could not be repeated by other physical methods. Some experimenters devised fantastic machines and some fortunate ones went on the right track with the result that it is possible today to carry on endless transmutations by various methods. Alpha particles, protons, diplons, nutrons and Cosmic Rays may be used for turning one element into another. Technicians have made it possible to handle the apparatus with utmost safety although in some cases some physicists of five feet nine inches have been reduced to a pinch of ash by generators producing millions of volts.

The 92 elements with which we started have been bombarded and we get 275 or more new elements, many being is topes. Today even Transuranium and two or three new kinds of Uranium have been successfully isolated in the laboratory. The Alchemist's dream has been realised and it is possible to change mercury into gold! Let us come back to the original problem of the production of energy by the sun.

Various theories have been put forward about the generation of energy by the sun. Some of these were too fantastic—for example it was said that some meteors reach the surface of the sun and get burnt up thus producing heat rays. Whatever be the theory of the production of energy, they all agreed that the sun will ultimately cool down and turn into a blue orb. We do not want to go into the details of all these funny explanations. Bethe has recently put forward the theory that explains the production of energy in the sun and the stars.

$$e = mc^2$$

where e is the energy
m is mass
and c is velocity.

So matter was no more indestructible in the previous sense of the word! Matter could be converted into energy and energy into matter. This exploded the old belief that matter cannot be created or destroyed. No clue was found as to how the sun was a source of energy. The Scientists were puzzled and anxious. Astronomers waited in vain for the sun turning blue and the Physicists upset by many revolutions in their concepts gave it up as a hopeless quest.

The solution came from an unexpected quarter. Many men have been striving for a formula for transmutation of baser metals into nobler ones. The genius of Greece, Rome, India, Muslim countries and Europe haunted in vain for that magic formula required for the transmutation. It was in 1919 after many quacks had been exposed and many dupes had been given up that the late Lord Rutherford succeeded in transmuting one element into the other. This first success was obtained by bombarding nitrogen by particles at Cambridge. This was a genuine case of one atom radically changing into another.

One word about the 'bricks of the universe'. We know that there are 92 elements in the universe. Some of them are in abundance and some rather scarce. The constituent particles are supposed to be electrons both positive and negative, heavy electrons, protons, nutrons and photons. This is probably the sum total of our knowledge of Physics. After Lord Rutherford's discovery pysicists, theoretical and experimental, worked on the possibilities of penetrating the nucleus. The nucleus is positively charged and negative electrons go round it endlessly. They do not collide but have stationary

the body of the sun and formed various planets. The outer temperature of the sun measured by various methods came out to be about 5,000° c, and compared to the snowy peaks of the Alps, the coolness of the stratosphere, and the solidified surface of Jupiter or Saturn, containing various gases at temperatures far below the ordinary room temperature, it is hot indeed!

In the last century the Principle of the Conservation of Energy was laid down. It said that it is not possible for matter to be converted into energy. We also know from Thermodynamical relations that the Entropy of the Universe is steadily increasing.

This inoffensive looking law in the hands of the phyisicist became a nuisance for the man in the street. It was trumpeted out that although the earth escapes annihilations even after passing through the tail of a comet, it cannot escape its future predestined destiny. The sun will radiate all energy, the world will cool down and a great glacial age will follow ending in a blue sun that will eventually grow black.

Imagination is a dangerous tool in the hands of the incompetent and headlines in newspapers inserted by inquisitive reporters started this belief that life on earth is not going to last long due to dearth of heat supply. It was a great problem to find out how the sun was radiating so much energy without shrinking in size. Scientists advocated the ultimate doom to take place with the same precision as the beats of Greenwich Chronometer. All attempts to solve this mystery, however glowing, were fruitless.

In the beginning of this century there were some faint hopes of solving the problem when Einstein formulated the principle of Conservation of mass. He suggested that

THE ETERNAL SUN

If we look up a dictionary we will find that Eternal is something whose presence is guaranteed for ever even in the distant future. If the sky is clear we can see the sun every morning. If we are on the equator, we will find that it comes out of the east, rises high in the sky, and goes down in the west. Still the Sun comes out. Is it Eternal ?

From time immemorial people have tried to speculate about the birth of the sun, its appearance and disappearance, and some speculators have ventured even to calculate its future destiny. As far as its appearance and disappearance are concerned, hundred and one stories, myths and legends have crept up associating it with gods, devils and what not. About its birth we know that it is like one of those billion stars we find scattered in the sky. Like men it has a family of its own. Whirling round on its axis having around it ever dancing planets, it is moving towards the star Vega as it has done for countless years. Where will this procession end ? We do not know at all !

There are two theories about its evolution and the evolution of its family. The *Nebular* Theory and the *Tidal* Theory. One assumes the existence of a gigantic nebula rotating about an axis and throwing out various parts that eventually cooled down and formed various planets. The other theory advocates that once upon a time a star passed near another star, now our sun. When they came nearer and nearer tides were produced and these tides after swelling up to a big height came out of

in its growing dignity and shapeliness. It is strikingly indicated by his metrical progress. He found metrical forms in the heroic heptastich and in the heroic couplet that satisfied the highest ideal. Thus he was induced to give up the old four-accented couplet which seems to him "light and lewd". He learned from Boccaccio how to decorate, polish and give warmth of passion to his verse; and how to describe lofty things,

But it should be remembered that he imitated not the letter but the spirit of Boccaccio and his other Italian masters alike. He was original in his treatment of subject, he did not confine himself to the subject-matter he borrowed, but poured out all his profound knowledge of different types of men and of manners. His works show his insight, fine descrimination and subtle humour.

S. M. TAQI HASHIMI,
M. A. (Econ.), M. A. (English).

cription of the despair of Troilus after the departure of his mistress, although all the drollery is invented by Chaucer.

In conclusion, it may be said that "Troilus and Cressida" was half Italian and half English.

A comparison between Boccaccio's "Decameron" and Chaucer's "Canterbury Tales" indicates that the former not only suggested the machinery but also provided the subject matter of the latter. Seven ladies and three gentlemen go to a country villa on account of the outbreak of the plague at Florence and there, in a garden, each tells stories in turn. This is the beginning of the "Decameron". Chaucer could not exactly copy it. So he too invented, like Boccaccio, an occasion for story-telling, by introducing a company of pilgrims bound for Canterbury. At the instance of the host of the Tabard Inn, who also joins them, each pilgrim agrees to tell two tales on the way to Canterbury and two on the way back, to beguile the tedium of the journey.

So far about the machinery which the "Decameron" suggested to "The Canterbury Tales". It also gave some of its most remarkable stories, such as the "Reeve's Tale", the Franklin's and the Shipman's tales to Chaucer. But this statement must be qualified, because it is also possible that Chaucer may have taken these stories from the "Fabliaux" which were recast by Boccaccio. Whatever the book, Boccaccio was the main source of this story.

In sum, the influence of Boccaccio upon Chaucer is beyond question. Nor is it to be measured by what he borrowed in the way of plot, incident or expression. It was far profounder than such debts might suggest. It recreated him as an artist, giving him a new and loftier conception of artistic form and beauty, This regeration is soon visible in the improvement of his style,

upon Boccaccio's "Teseide". But the former is an epitome of the latter and if the former is a romance of sentiment, the latter is a pseudo-epic. The descriptions in the "Knight's Tale" read like Boccaccio, but Chaucer adds to it homeliness by introducing certain scenes, and humour, by turning Theseus into a comic figure of his own liking. The "Tale" narrates the story of the Palamon and Arcite in rivalry which is medievel. Its interest lies in the romantic treatment of the pot.

His "Troilus and Cressida" is half translated and half adapted from Boccaccio's "Il Filostrato". The latter poem deals with the loves of Troilus and Cressida. At first Cressida loves and then betrays Troilus. Cressida's young cousin, Pandaro, who is a prudent and disinterested man, serves Troilus' love. The poem is impassioned, harmonious and swift in action.

Chaucer conceived the characters and the sentiments of Boccaccio's poem in a different way. While Boccaccio intended to depcit passion and voluptuousness, Chaucer's object was to create character-studies. Chaucer's Pandarus is different from Boccaccio's Pandaro. He is not the cousin but the uncle of Cressida; he is the central comic figure, loquacious, and with his proverbs and maxims he is reminiscent of Polonius and sometimes of Sancho Panza. It is his continuous prating which is responsible for the addition of two or three thousand lines to the Italian poem. Though Chaucer's poem moves slowly, in comparison with Boccaccio's, yet the comic scenes relieve the pathos in the poem which is deeply felt in "Il Filostroto". The Italian poet simply gives expression to sentiments, while the English poet aspires to reflect life.

So far about his deviations from his original. But so far as the poetic passages of the poem are concerned, they are verbatim translations from the Italian, for example the des-

the Italian writers who exerted influence upon him are Dante, Petrarch and more particularly Boccaccio.

Chaucer's "The House of Fame," "The Assembly of Fowls" and "The Monk's Tale" reflect the profound influence of Dante. But Dante, the visionary, was not a suitable source of inspiration for Chaucer, the realist.

It is not unlikely that he met Petrarch at Padua. He held him in high esteem. The tale of Grisilda is taken from a Latin letter of Petrarch's, to whom Chaucer acknowledges his obligation in the "Clerke's Prologue". But the spirit of humanism, the excessive subtlety and the idealism pervading Petrarch's work, did not appeal to him; so he could not follow him.

But, on the other hand, it was Boccaccio who had the greatest influence upon Chaucer. But oddly enough, he never mentions Boccaccio by name. In "Troilus and Cressida" he would seem to denote him by the name of Lollius. Whether Chaucer had met him in Italy, is a moot question. It is said that Chaucer had only read Boccaccio's poetical works and his "De Casibus Virorum Illustrium" and "De Claris Mulieribus". The statement that he had not gone through the "Decameron" is not true because, as we shall see later on, some of his works were based upon that book.

Generally speaking, Chaucer borrowed some stories from Boccaccio and learnt from him how to write "splendidly decorated and warmly passionate" verses. His "Knight's Tale", "Troilus and Cressida.' and the "Reeve's Tale" the Shipman's and the Franklin's tales were all borrowed from Boccaccio.

The poems which Boccaccio wrote in his youth had considerable influence on Chaucer. His "Knight's Tale" is based

BOCCACCIO AND CHAUCER

No literary work in the world is original in the literal sense of the word. Originality and initiation go together—the latter may be either conscious or unconscious. The edifice of literature, like that of any other branch of human knowledge and art, is not erected by any single individual. Nature employs many individuals for the task at different times, assigning to each of them the part of the work for which he is fit and capable. They come alternately and one begins his work from the point where the other had stopped his. Thus one's work forms the basis of the other. But the credit goes generally to the founders and the pioneers.

Plagiarism is a literary sin; but borrowing is certainly the privilege of all writers, if they, in Milton's words, "borrow and better in the borrowing". Originality in theme and treatment is, of course, highly creditable, though, broadly speaking, founders get the opportunity of showing this kind of originality; but that the writer may also be regarded as original who is, at least, the same in the treatment of his subject. For this reason, such great men of letters as Shakespeare, Milton and, coming to the point, Chaucer are considered to be original.

How far was Chaucer, the subject of our essay, influenced by, or what was his debt to Boccaccio?

We know that before 1370 he was under the French influence, and from that date to 1384 is the period in which his writings show a marked influence of the Italian writers of his times, which may be accounted by his tour to Italy. Among

as they will already have been seen by the professors concerned which can be directly sent to the press with the permission of the advisers.

Secondly, if the University Press undertakes to print the Magazine, on proper net rates, it would be cheaper and more punctual. From all points of view the Magazine will appear better if printed at the University itself.

If that is arranged we are sure that the yearly Editorial changes will not in the least delay the printing the magazine at the proper time.

The nebulous state of the constitution has led us to great difficulties. In the interests of the University and the students, we must request the coming Editor to kindly settle all these things, as this will not only increase the status of our magazine but also create a good feeling among us.

About the articles published, we are glad to say that nearly all of them are by students. This shows that the standard of English in our University is rising, and we hope that we shall be able to produce some very good articles in the near future. Some other good articles have been kept for the next issue.

In the end we feel grateful to our beloved Pro-Vice-Chancellor, whose especial care and guidance made our task easy.

My thanks are due to Prof. Krishnan, Adviser, English Section, whose guidance was of great help to us.

We must thank Dr. Zoar, Adviser, Urdu Section and Prof. Wahidur Rahman, Hon. Treasurer, whose instructions at all times were of great help to us.

In the end I must thank all those Editors, who co-operated with me in making the Magazine come up to such a high standard.

Dr. Chandra, as he is very well known to all of us. We express our gratitude to him for his keen interest in us.

Old Boys' Union and Graduates Association.—These two institutions are the only associations for Ex-Osmania's, as such their activities ought to be watched by us with interest. Osmanias are one, and there must be no disintegration among them. Their ideal must be serene, their desires pure and their work unselfish. We hope they will surely help their Alma Mater, their country and their king, by creating harmony and a healthy spirit.

Magazine.—The Editorship of a magazine is not a bed of roses: especially of a magazine in which the editors are honorary. There are many criticism and disapprovals and rebuffs against a very few people who happen to stand on the stairs of the Arts College with the editorial bag in their hand, facing the panorama of brother students in front.

Opposition there is sure to be, and every opposition healthy in spirit must be welcomed. But people should understand the difference between essentials and mere empty shows. The real merit is their work in the University; and that student who works on Arts or Science, and thus raises the standard of the University represents the true ideal student.

The magazine has of late been issued rather delayed. The reasons being that the articles we receive from the students are very few and scanty, for which we have to wait a long time. In reality we do not get articles even after requests, blandishments, and entreaties. The thing is not that there is any paucity of writers in our University, but that there is no stimulus for them to write. Many research essays are being written every year. If the Sub-Unions are made responsible to send to the Magazine at least two articles pertaining to their subjects every year, there will be no difficulty for the Editors,

Urdu Department.— We must congratulate Dr. Mohiuddin Khadri Zoar on his appointment as the Head of Urdu Department. Dr. Zoar is very near to us, as he is the Adviser of our Magazine. Dr. Zoar Sahib's works on the Urdu Literature need no introduction to the lovers of Urdu language. We are glad to hear that Dr. Zoar Sahib has organised the Urdu Union, which was sleeping during the past few years.

Annual Examinations.— There has been a call from the students for the biannual examination in our University. Examinations truly speaking are not a real test of merit, and to waste a whole year of a student, who happens to fail once, does not seem wise. We request the authorities to kindly consider this matter seriously.

Civilians:— This year Mr. S. K. Sinha and Mr. Noor-ul-Hasan Jaffery have come out successful in the Civil Service Examination from our University. Mr. S. K. Sinha is a distinguished student of our University, and we are sure his services will be useful to the Dominions.

We hope their work will be that of an ideal Civilian: and they should remember that with their name is associated the sacred name of Osmania—to brighten it more and more being their sacred duty.

Dining Hall.—In continuation of our previous note, in the last Editorial, we must congratulate Mr. Shiv Mohan Lal, for maintaining a high standard of meals in Dining Hall No. 2, for a very long time.

Dispensary.—Dr. Narayan Rao, who was appointed last year Medical Officer of our University has endeared himself to the students, by the especial care that he takes of the patients.

The appointment of the famous Dr. Bankat Chandra as the Senior Medical Officer this year has been of immense help to the students. We need not say anything about

EDITORIAL

With this issue we place the third number of our Magazine, in the hands of our brethren.

War.— In the last few months, what great changes have there been in the world! The war has spread far and wide bringing devastation and misery in its wake. With Japan also upon the war-path, the peril to us is great and close-by. Let us hope and pray that the end is near.

Special Convocation:— This year has been a very gracious year for Osmania University as it had the honour of conferring the honorary degree of Doctor of Laws upon Prince Moazzam Jah Bahadur. The personality of this great Prince is already famous for his learning and poetic genius. The University honours itself by honouring the Prince.

Our New Chancellor.— It is with great joy and hope that we welcome our new Chancellor Col. Hafiz Sir Mohammed Ahmad Saeed Khan Bahadur, Nawab of Chattari, and as he is a great benefactor of students, we expect much from him. The speech of H. E. the Chancellor in the University has been a great inspiration for action, inculcating a spirit of enthusiasm and work in us. The Chancellor's stress on the harmonious relationships between the professors and the students, and the cultivation of character is a wise and necessary counsel by which we hope to be profitted.

We must understand that a University is not a place of mere acquisition of knowledge, but a place for the building of Character, for the tolerance and gentleness of the mature mind, and the quiet content of the progressive soul. If we look through the map of past history, we shall come to know that this true spirit of University is purely national and Indian, which emanated from the great Universities of Nalanda and Taxila—the great centres of knowledge and civilisation.

CONTENTS

The Osmania Magazine

Vol. XIV. No. 3.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

MANAGING EDITOR, & EDITOR, ENGLISH SECTION:

KRISHEN DAYAL MATHUR, B.Sc., (OSMANIA).

JOINT EDITOR:

MALICK ARJUN PATEL, B.Sc., FINAL (OSMANIA).

Vol. XIV. 1941 No. 3.

Printed at
THE OSMANIA PRINTING WORKS.
Kingsway, Secunderabad.

THE

OSMANIA MAGAZINE

1941

EDITOR
KRISHEN DAYAL MATHUR B Sc (OSMANIA)
JOINT EDITOR
MALLICK ARJUN PATEL B Sc FINAL (OSMANIA)